شخصیات

ڈاکٹر اقبال

مصطفےٰ کمال

مولینا محمد علی

مولینا محمد سورتی

مولینا عبیداللہ سندھی

مولینا ابوالکلام آزاد

ڈاکٹر ذاکر حسین

چودھری اکبر علی

مولینا حسرت موہانی

جوش ملیح آبادی

جگر مرادآبادی

حفیظ جالندھری

بیدی، کرشن، اشک

ن۔م۔ راشد

سعادت حسن منٹو

ادارہ ادبیاتِ نو۔ لاہور

شخصیات

محمد سرور

ادارہ ادبیاتِ نو۔ لاہور

قیمت

مرکنٹائل پریس لاہور میں محمد صدیق پرنٹر پبلشر نے چھپوا کر ادارہ ادبیات نو
۵۸ ٹمپل روڈ لاہور سے شائع کی۔

فہرست

عرضِ ناشر

یہ کتاب مجموعہ ہے ان مضامین کا جو مصنف نے وقتاً فوقتاً مختلف موقعوں پر گذشتہ چھ برس میں مشہور شخصیات کے متعلق لکھے۔ ان مشہور شخصیات میں بعض تو بین الاقوامی شہرت کی ہستیاں ہیں اور بعض ہماری سیاسی اور قومی زندگی کے نامور زعماء اور قائد ہیں لیکن زیرِ نظر کتاب میں زیادہ تر وہ مضامین ہیں جن میں مصنف نے ان ادبا اور شعراء کا تعارف کرایا ہے جو خدا کے فضل سے اب تک زندہ ہیں۔ یہ تعارف گو مختصر سہی، لیکن اس اختصار کے باوجود اس تعارف کی مدد سے ہم ان ادباء اور شعراء کی شخصیتوں کا ایک مجمل لیکن جامع تصور قائم کر سکتے ہیں۔ مولانا محمد سورتی عربی زبان کے ایک بے نظیر ادیب اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دلی میں پروفیسر تھے۔ ان کے انتقال پر مصنف نے جو مولانا کے شاگرد ہیں، مرحوم کے متعلق ایک مضمون لکھا جو اُس وقت رسالہ "جامعہ" میں چھپا تھا۔ چودھری اکبر علی جامعہ کے ایک نہایت ہر دلعزیز اور ہمہ صفت موصوف استاد تھے۔ موصوف رام پور میں ریاست کی تعلیمات کی تنظیم اور اسکی نگرانی کیلئے جامعہ کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔ اور اسی اثنا میں ان کا انتقال ہو گیا۔

غازی مصطفےٰ کمال کی وفات پر جامعہ میں ایک جلسۂ تعزیت ہوا تھا جس میں مصنف نے غازی مرحوم پر ایک مضمون پڑھا تھا جو بعد میں رسالہ جامعہ میں شائع ہوا۔ مولینا عبیداللہ سندھی عنوان کا جو مضمون ہے، وہ پہلے رسالہ کتاب لاہور میں چھپا تھا اور پھر اُسے مولینا کے حالات و افکار پر جو کتاب شائع ہوئی ہے اس میں شامل کر دیا گیا۔ ادبار و شعراء کے مختصر تبصرے بھی پہلے پہل رسالہ کتاب میں شائع ہوتے تھے۔ ہاں جگر، راشد اور اقبال پر جو مضامین ہیں۔ وہ اس صورت میں اب تک کہیں نہیں چھپے۔

مصنف ان مضامین کو کتابی شکل میں شائع کرانے پر آمادہ نہ تھے۔ میں نے از خود رسائل سے ان مضامین کو اکٹھا کیا اور پھر بڑے اصرار کے بعد موصوف کو اس امر پر راضی کرنے میں میں کامیاب ہو سکا کہ وہ ان مضامین کی نظر ثانی کریں۔ اور انھیں کتاب کی صورت میں شائع کرنے کی اجازت دیں۔ اس کام میں اگر مصنف کے محترم اور عزیز دوست جناب مرزا محمد حسین صاحب میری مدد نہ فرماتے اور ان مضامین کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی ضرورت کا مسرور صاحب کو یقین نہ دلاتے تو شاید یہ کتاب کبھی بھی قارئین کرام کی خدمت میں پیش نہ کی جا سکتی۔

امید ہے میری یہ کوشش اہل نظر کی خوشنودی سے محروم نہ رہے گی۔

محمد صدیق

اقبال

اقبال کی عظیم المرتبت شخصیت کی وسعتوں کو سمیٹنا بڑا مشکل کام ہے۔ کہنے کو تو وہ اُردو اور فارسی کے ایک بہت بڑے شاعر ہیں لیکن ان کی شاعری کی حدیں بہت دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اصل میں شاعری کی حیثیت ان کے نزدیک مقصد کی نہ تھی، بلکہ وہ ذریعہ تھی، ان کے پیغام کی اشاعت کا، جو وہ اپنی قوم کی زبان اور اس کے وساطت سے ساری انسانیت کو دینا چاہتے تھے۔ اقبال اپنی شاعری میں ایک ادیب اور فن کار سے زیادہ ایک پیغامبر ہیں چنانچہ ان کی شاعری صحیح معنوں میں "جزویست از پیغمبری" کہلانے کا حق رکھتی ہے، وہ ایک بلند پایہ مفکر اور فلسفی بھی تھے، جن کو نہ صرف یورپ کے جدید فلسفہ و حکمت پر پورا عبور تھا، بلکہ وہ اسلامی فکر کی تمام تاریخ پر بھی نظر رکھتے تھے۔ وہ علوم اجتماعیات کے مُبصر تھے، تمدنِ انسانی کے نشیب و فراز کی تاریخ کا تنقیدی مطالعہ کیا تھا۔ طبیعات نے اس دور میں مشاہدہ و تجربہ کی مدد سے زندگی کے اسرار کو جس طرح حل کرنے کی کوشش کی ہے، اس سے پورے آگاہ تھے اور پھر وہ صاحب وجدان بھی تھے۔ اور وجدان کی صحیح تربیت، اور اس کی قوت اور تاثیر کو حدِ کمال تک پہنچانے میں انہوں نے پوری جدوجہد کی تھی۔

دل و دماغ کی ان خداداد نعمتوں اور اپنے مطالعہ و محنت سے حاصل کی ہوئی ساری کی ساری صلاحیتوں کو اقبال نے صرف ایک کام کیلئے وقف کر دیا تھا اور وہ تمام عمر اسی کام میں لگے رہے۔ انکی زندگی کا حاصل اور اصل مقصود بس یہی کام تھا اور وہ جیتے تھے تو اسی کام کے لئے اور یہ کام تھا اپنے زمانہ کو ایک پیغام دینا۔ انہوں نے یہ پیغام ہر رنگ اور ہر آہنگ میں دیا۔ کبھی

اس کے لئے اردو اور فارسی کا شاعرانہ جامہ اختیار کیا اور کبھی انگریزی زبان میں اس پیغام کو اہل نظر تک پہنچانے کی کوشش کی۔ انکی گفتگو، ان کی تحریر، ان کی تقریر اور انکی سیاسی سرگرمیاں سب کا حاصل مدعا صرف اسی پیغام کی اشاعت تھی۔ اور جب وہ بستر مرگ پر تھے تو جو بھی ان سے ملنے آتا مرحوم اس سے اپنے اسی پیغام کے بارے میں گفتگو فرماتے۔ ان سطور میں اقبال کے اس پیغام کا ایک دھندلا سا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کائنات میں قدرت کا سب سے بڑا شہکار انسان ہے۔ اس کے دم سے دنیا کا یہ سارا کارخانہ چل رہا ہے۔ زمین و آسمان کی سب چیزیں اسی کے لئے مسخر کی گئی ہیں لیکن خود اس کی زندگی کے ثبات کا یہ حال ہے کہ ابھی ہے اور ابھی نہیں۔ ایک شعلے کی طرح بھڑکا اور پھر ہوا کے ایک جھونکے سے بجھ گیا۔ موت اٹھوں پہر اسکی گھات میں رہتی ہے اور ذرا بھی موقعہ ملتا ہے تو اُسے ہست سے نیست کر دیتی ہے۔ آخر یہ راز کیا ہے؟ کیا انسان کی زندگی واقعی اتنی بے ثبات ہے؟ اور اس کا وجود موت کے ہاتھوں اس قدر آسانی سے مٹ جاتا ہے؟ کیا قدرت کے شہکار کا یہی انجام مقدر میں لکھا ہے۔ اقبال نے اپنے پیام میں زندگی کے اسی راز سربستہ سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ انکے نزدیک یہ بڑا اہم مسئلہ ہے۔ اور اسی کے صحیح حل پر افراد اور اقوام کی زندگی کا ہمیشہ سے دارومدار رہا ہے۔ چنانچہ اسرار خودی کے دیباچہ میں فرماتے ہیں۔

"یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں، یہ پُراسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔ یہ "خودی" یا "انا" یا "میں" جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے۔ جو تمام مشاہدات کی خالق ہے، مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لاسکتی، کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرز عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور

یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے حکما اور علما نے کسی نہ کسی صورت میں اس کا جواب پیدا کرنے کے لئے دماغ سوزی نہ کی ہو"؟

اقبال نے اپنی تصنیفات میں اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسانی زندگی کا یہ مرکزی نقطہ یعنی "انا" یا "میں" یا "خودی" فنا پذیر نہیں۔ لیکن یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ اپنے آپ کو عمل سے لازوال بنائے۔ عمل سے خودی کو نہ صرف اس دنیا میں ثبات اور استحکام ملتا ہے، بلکہ مرنے کے بعد بھی عمل کے صلہ میں یہ خودی حیات جاوداں پاتی ہے۔ الغرض زندگی کے اثبات استحکام اور توسیع کے لئے عمل، حرکت اور جد وجہد ضروری ہے اور عمل کے بغیر زندگی کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے۔

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند — سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
سفر زندگی کے لئے برگ و ساز — سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے — تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے
ہوا جب اسے سامنا موت کا — کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا
اتر کر جہانِ مکافات میں — رہی زندگی موت کی گھات میں
مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج — اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے — اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات — ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

زندگی کی نمو ذوقِ پرواز سے ہے، چنانچہ خودی جب عمل کے ذریعہ اپنے آپ کو محکم بنا لیتی ہے تو اسکے سامنے اس دنیا کے بعد بھی ترقی کی بے کنار وسعتیں کھل جاتی ہیں اور اس عالم آب و گل

کی محدود فضا میں گھر کر نہیں رہ جاتی۔

خودی کی یہ ہے منزل اولیں — مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کرہ گراں توڑ کر — طلسم زمان و مکاں توڑ کر
خودی شیر مولا جہاں اسکا صید — زمیں اس کا صید آسماں اس کا صید
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا — تری شوخیٔ فکر و کردار کا

یہ عمل کیا ہے؟ اور یہ پیہم جد وجہد اور مسلسل کشمکش کس مقصد کے لیئے ہو۔ اور کس طرح ہو؟ اقبال کا انفرادی اور اجتماعی فلسفۂ اخلاق، اور اس کا مابعد الطبیعاتی تصورِ حیات اسی مسئلہ کی تفسیر اور تشریح ہے۔ عمل کی دعوت اقبال کے پیغام کا اساس ہے۔ اور اس پر اس کی تمام تعلیمات کی عمارت اٹھائی گئی ہے۔ اقبال کے نزدیک وہ عمل جس سے خودی لازوال بنتی ہے۔ اور انسان اس کی وجہ سے موت سے بھی مر نہیں سکتا، وہ عمل، عمل صالح ہے۔ عمل صالح ہی سے خودی کو استحکام ملتا ہے۔ اور انسان کے عزم وارادہ میں اسی سے پختگی پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی اسے فرماندۂ عالم بنا دیتی ہے۔ اور اسی کے طفیل یہ خاکی انسان اس بلند منصب پر فائز ہو سکتا ہے کہ:۔

پنجۂ او پنجۂ حق می شود — ماہ از انگشت او شق می شود
در خصومات جہاں گردد حکم — تابع فرمانِ او دارا و جم

عمل صالح ممدِ حیات ہے، وہ صرف تن کو قوت نہیں بخشتا، بلکہ تن کے اندر جو جان ہے عمل صالح اس کے نمو کا بھی باعث بنتا ہے۔

بے شک عمل صالح فرد کی زندگی کو محکم بناتا ہے۔ لیکن فرد کا یہ استحکام اس وقت تک بے معنی رہتا ہے اور اس سے اسے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جب تک وہ کسی انسانی اجتماع کے

ساتھ اپنے آپ کو وابستہ نہ کر دے۔ چنانچہ عمل صالح کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس سے اجتماع انسانی کو قوت اور نمو ملے۔ اقبال کے اجتماعی فلسفہ کا یہ موضوع ہے۔ اس میں انہوں نے بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ کس طرح فرد کو اپنی خودی کی تکمیل کر کے اجتماع کی بڑی خودی کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کر دینا چاہیئے۔ "رموز بیخودی" کے دیباچہ میں "بے خودی" کی ضرورت اور اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں۔

"جس طرح حیات افراد میں جلب منفعت، دفع مضرت، تعین عمل و ذوق حیات عالیہ، احساس نفس کی تدریجی نشوونما، اس کے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے اسی طرح ملل و اقوام کی حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظ دیگر "قومی اَنا" کی حفاظت تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیات ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افراد کسی آئین مسلّم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کی حدود مقرر کریں تاکہ انفرادی اعمال کا تباین و تناقض مٹ کر تمام قوم کے لئے ایک قلب مشترک پیدا ہو جائے"۔

انفرادی "اَنا" کی حفاظت بہت ضروری چیز ہے۔ اسی طرح افراد کے مختلف اَنا مل کر جب قومی "اَنا" کی شکل اختیار کرتے ہیں، تو اس کے استحکام اور ترقی کے لئے بھی عمل کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن آخر یہ قوم بھی کل نوعِ انسانی کا ایک حصہ ہی تو ہے اور اگر کل اور جزو کے اعمال میں پوری ہم آہنگی نہ ہو تو زندگی ظاہر ہے مجموعی حیثیت سے ہموار اور متوازن نہیں ہو سکتی۔ اور اس کی وجہ سے نہ فرد کی صحیح نمو ہو سکے گی، اور نہ قومی "اَنا" ہی پوری نشوونما پا سکے گا! اقبال تمام انسانیت کی فلاح و بقا کے پیش نظر ایسے اصول و مبادی کی طرف بھی ہماری رہنمائی کرتا ہے جن سے ایک قوم کا عمل صالح مجموعی انسانیت کے عمل صالح کے متعارض نہیں ہوتا بلکہ جس طرح فرد کی خودی کے استحکام سے قوم کی خودی کو تقویت ملتی ہے، اسی طرح قومی خودی کا وجود کل انسانیت کے فروغ و ترقی کا باعث بنتا ہے۔

فرد، جماعت اور انسانیت، ہماری زندگی کے یہ تین مدارج ہیں۔ اور انفرادی، جماعتی

اور انسانی زندگی کے اثبات، استحکام اور توسیع کا راستہ صرف عمل صالح ہی ہے۔ اور اسی کی بدولت انسانی زندگی قوت و دوام حاصل کرتی ہے لیکن زندگی کی آخری حد انسانیت پر ختم تو نہیں ہو جاتی، کائنات کی وسعتوں میں انسانیت کی مثال دریا میں ایک قطرے کی سمجھئے۔ اقبال کا تصور الٰہیات کائنات کے اس معمے کو حل کرتا ہے۔ الغرض انفرادی خودی کے استحکام سے شروع کر کے زندگی کی آخری منزل تک انسانی ذہن و عمل کو جو جو منزلیں طے کرنا پڑتی ہیں اقبال اس سلسلہ میں ہمیں شمع ہدایت دکھاتا ہے۔ اس کا پیغام عمل کے ذریعہ زندگی کو اس کے محدود اور وسیع دونوں معنوں میں ابدی اور لازوال بنانے کا پیغام ہے۔

عمل نام ہے کچھ کرنے کا۔ اور آدمی اسوقت کچھ کرتا ہے۔ جب اس کے اندر کوئی ولولہ کوئی جذبہ، کوئی حرکت و اضطراب ہو۔ انسان کے باطن میں جب ہلچل ہوتی ہے تو پھر جا کر خارج میں عمل ظہور پذیر ہوتا ہے۔ لیکن یہ عمل، عمل صالح اسوقت ہوگا، جبکہ یہ نتیجہ ہو انسانی شعور کی ایسی باطنی حرکت کا جو کسی اعلیٰ مقصد اور بلند نصب العین کے لئے وجود میں آئی ہو۔ صالح عمل اعلیٰ مقصد کا ممنون احسان ہوتا ہے۔ اور اعلیٰ مقصد ہی خودی کی تربیت کرتا ہے۔ جب دل میں کسی اعلیٰ مقصد کی آرزو ہو اور اس کو حاصل کرنے کی انسان اپنے اندر تڑپ محسوس کرے تو اسوقت اور صرف اس وقت جوش کردار قوائے انسانی کو عمل صالح کیلئے حرکت میں لاتا ہے۔

زندگانی را بقا از مدعا است — کاروانش را درا از مدعا است
زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصل او در آرزو پوشیدہ است
زندگی سرمایہ دار آرزو است — عقل از زائیدگانِ بطن اوست

چنانچہ عمل صالح کے ذریعہ خودی کو محکم بنانے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کے اصل سبب کو اپنے اندر جگہ دے۔

اے زراز زندگی بیگانہ خیز — از شراب مقصدے مستانہ خیز
مقصدے مثلِ سحر تابندۂ — ماسوا را آتشِ سوزندۂ

مقصدے از آسماں بالا ترے　　دلربائے دلستانے دلبرے
ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم　　از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

اقبال کے نزدیک آرزو ہی جہانِ رنگ و بو کی جان ہے۔ اور ہر شے کی فطرت آرزو ہی کی امین ہے۔ انسان کو آرزو سے اپنے دل کو زندہ و بیدار رکھنا چاہیئے ورنہ وہ مزار کی ایک مشتِ خاک بن کر رہ جائے گا۔

انسان کے دل میں آرزو کی جتنی گرمی ہوگی! اور اپنے اعلیٰ مقصد اور نصب العین کے ساتھ اُسے جس قدر شیفتگی ہوگی، اسی قدر اس کے عمل صالح میں قوت اور تاثیر ہوگی۔ اور اسی حساب کر اس کی خودی کو استحکام نصیب ہوگا۔ آرزو کی گرمی اور اعلیٰ مقصد کے ساتھ شیفتگی میں نقطۂ کمال کو اقبال عشق کا نام دیتے ہیں۔ اس عشق سے خودی کی قوتوں میں لا نہایت ترقی ہوتی ہے۔ اور ایسے صاحب عشق فرد سے جو کام سرانجام ہو، اس کی رفعت اور پائداری کا کیا کہنا۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ　　عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام
تندو سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو　　عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات　　عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

جو زندگی عشق کی بھٹی میں تپ کر نکلتی ہے۔ اسی کی جدوجہد اور سعی و عمل صحیح معنوں میں پائندہ اس دنیا میں عزت اور بقا حاصل کر سکتی ہے۔ اور اس میں بھی بڑے مدارج ہیں جتنی بلند ذات اور جس قدر اعلیٰ مقصد عشق کا موضوع ہوگا اسی قدر اس شخص کے کاموں میں توانائی اور ثبات ہوگا۔

از نگاہِ عشق، خارا شق شود　　عشقِ حق آخر سراپا حق شود
عاشقی آموز و محبوبے طلب　　چشمِ نوحے قلبِ ایوبے طلب
کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے　　بوسہ زن بر آستانِ کاملے

عاشق معشوق کی ذات میں اپنے وجود کو گم کرکے کھو نہیں جاتا۔ بلکہ وہ معشوق کے اعلیٰ اوصاف کو اپنی ذات میں ہضم کرکے اپنے آپ کو اسی بلند مقام پر پہنچا دیتا ہے جس پر اس

کا معشوق فائز ہوتا ہے۔ اس لئے انسان کو کسی کامل کے آستان کی طرف رجوع کرنا چاہئے تاکہ اس کی برکت سے۔

دل ز عشق او توانا می شود خاک ہمدوش ثریا می شود

زندگی کے لئے جد و جہد ضروری ہے۔ اور اس جد و جہد کے لئے مقاصد کا متعین کرنا لازمی ہوتا ہے۔ ان مقاصد سے انسان کو جتنا دلی تعلق ہوگا، اسی قدر اس کی زندگی میں پختگی اور وسعت ہوگی۔ اقبال کے نزدیک انسانی زندگی کا ایک بہت بڑا مقصد تو یہ ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کی کائنات کا علم حاصل کرے اور اس کی تسخیر کے لئے مصروف عمل ہو۔ آدم کی تخلیق کا مقصد بھی اصل میں یہی علمِ کائنات اور تسخیر کائنات ہے۔ اُسے ہر لمحہ اور ہر لحظہ اس سے نبرد آزما ہونا چاہیئے۔ اسی سے زندگی میں حرارت، شوق اور نمو پیدا ہوتی ہے "حیات در اصل ایک ترقی کرنے اور کائنات کو اپنے اندر جذب کرنیوالی حرکت کا نام ہے جو رکاوٹیں اس کی راہ میں حائل ہوتی ہیں، وہ ان پر غلبہ پاکر آگے بڑھتی ہے۔ حیات کا خاصہ یا جوہر طبعی یہ ہے کہ وہ مسلسل نئی نئی آرزوئیں پیدا کرتی رہتی ہے، اپنی حفاظت اور ترقی کے لئے اس نے آلات و وسائل پیدا کرلئے ہیں۔ جیسے حواس و ادراک، جن کی بدولت وہ دشواریوں پر غالب آتی ہے۔" خودی حقیقت میں کائنات کی اس طرح تسخیر کرنے سے خود اپنی جبلّی قوتوں اور خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرتی ہے اور زمانے کا مد و جزر اس کے فطری جوہروں کو آب و تاب بخشتا ہے۔

یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

انسان کائنات کی تسخیر کرکے اس دنیا میں خدا کا نائب بن سکتا ہے! اور اقبال کے نزدیک انسان کے لئے یہی مقدر ہو چکا ہے۔ لیکن کائنات کو مسخر کرکے اُسے انسانیت کے لئے مجموعی طور پر باعث خیر و برکت بنانے کی راہ اتنی آسان نہیں۔ اس کے لئے فرد کو آئین کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ اور جماعت کو اپنی اغراض عام انسانی اصولوں کے تابع کرنا پڑتی ہیں۔

فرد کی تکمیل، جماعتی زندگی کی تنظیم اور عام انسانیت میں ہم آہنگی اور توافق پیدا کرنے کا یہ پیغام ظاہر ہے کسی ملک یا قوم کے لئے مخصوص نہیں، قدرتی طور پر اقبال کی اس دعوت کے مخاطب ہر مذہب اور ملت کے افراد ہو سکتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ آخر اقبال نے اپنے پیام کو اسلامی ملت کے دائرہ تک کیوں محدود کر دیا. کیا یہ حد بندی اور تخصیص اقبال کی عالمگیر اور ہمہ گیر شخصیت کا نقص نہیں. کیا یہ بہتر نہ تھا کہ وہ اپنی دعوت کو عام رہنے دیتے اور کسی ملت کے مقاصد کو اپنے تصورات عمومی کا موضوع نہ بناتے۔

اقبال کی دعوت کے اصول ومبادی کی عمومیت کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ان کے پیغام سے ہر شخص برابر مستفید ہو سکتا ہے۔ انہوں نے "پیام مشرق" کے دیباچہ میں خود وضاحت فرمائی ہے کہ ان کے نزدیک "ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو. قابل احترام ہے"۔ لیکن اس سلسلے میں یہ بات بھی بھولنی نہ چاہئیے کہ اقبال عمل کی دعوت دیتے ہیں اور عمل کے لئے تحدید اور تخصیص ضروری ہوتی ہے. محض تصورات کی دنیا تو لامحدود ہو سکتی ہے۔ لیکن جب ہم کسی تصور کو عملی نصب العین کی حیثیت سے اپنائیں گے تو لازمی ہے کہ اس کی کچھ حدود متعین کریں۔ یہ حد بندی نقص کی دلیل نہیں ہوتی۔ بلکہ سچ پوچھئے تو تحدید کمال کے لئے ضروری شرط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے تصورات اتنے ہی عام اور ہمہ گیر ہیں، جتنی کہ خود انسانیت ہے لیکن انکے نزدیک ان عمومی تصورات کی اگر کوئی عملی شکل اس دنیا میں موجود ہے تو وہ اسلام اور اسکی ملت کی ہے. چنانچہ وہ اپنی عمومی دعوت میں اس کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ موصوف اسلام کو صحیح ترین انسانی نظام کی عملی تعبیر سمجھتے ہیں۔ اور اسی بنا پر وہ اپنے مذکورہ بالا عمومی تصورات اور اسلام کی بیک وقت دعوت دیتے ہوئے کسی قسم کا تناقض محسوس نہیں کرتے. چنانچہ فرماتے ہیں۔

"اگر عالم بشریت کا مقصد اقوام انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی

ہستیوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام بنانا قرار دیا جائے تو سوائے نظام اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے، اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے ...... یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ "دین" نہ قومی ہے، نہ انفرادی اور نہ پرائیوٹ بلکہ خالصۃً انسانی ہے، اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا دستور العمل" قوم و نسل پر بنایا نہیں جاسکتا۔ نہ اس کو پرائیوٹ کہہ سکتے ہیں، بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی مبنی کیا جاسکتا ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہوسکتی ہے:

اقبال کے نزدیک اسلامی ملت اور انسانی وحدت دو الگ چیزیں نہیں۔ وہ اصولاً تو انسانی وحدت کو مانتے ہیں لیکن عملاً وہ اس وحدت کو اسلامی ملت میں مرتکز سمجھتے ہیں۔ یکم جنوری ۱۹۳۵ء کو سال نو کے موقعہ پر ریڈیو سے ان کا ایک پیغام نشر ہوا تھا جس کے آخری الفاظ یہ تھے۔

"وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے، اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے۔ جو نسل و زبان و رنگ سے بالاتر ہو۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی، اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کر دیا جائے گا۔ جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے "الخلق عیال اللہ" کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا۔ جب تک جغرافی وطن پرستی۔ اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائیگا۔ اسوقت انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکیں گے! اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہوں گے۔"

غازی مصطفیٰ کمال

۹ رنومبر ۱۹۳۸ء جمعرات کی صبح کو ایک طویل علالت کے بعد غازی مصطفیٰ کمال پاشا نے انتقال فرمایا۔ اُن کی موت کا صدمہ کون ہے جس نے محسوس نہ کیا ہو۔ اُن کے عقیدت مند، اُن کے بہت سے کاموں کو سراہنے والے اور بعض پر اعتراض کرنے والے، اُن کے مخالفین اور ان کے سخت دشمن سب کے سب اس حادثہ سے متاثر ہیں کوئی زیادہ متاثر ہے اور کوئی کم۔ دُنیا کے حالات سے خبر رکھنے والا کوئی ایسا انسان نہ ہوگا، جس نے مصطفیٰ کمال پاشا کی وفات کی خبر سُنی ہو۔ اور اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز شخصیت کا نقشہ نہ کھنچ گیا ہو۔ مصطفیٰ اتاترک کو ماننے والے بہت سے تھے اور اُن کو ناپسند کرنے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ لیکن مرحوم کی بڑائی یہ ہے کہ اُن کے دوست تو عقیدت کیش تھے ہی، ان کے سخت سے سخت دشمن بھی ان کی عظمت کے معترف ہیں۔ اُن کے کام بڑے تھے اور بڑے کاموں کا انکار مشکل ہوتا ہے اور یہی وہ صفت ہے جس کے کمال کا مظہر مصطفیٰ کمال کی ذات گرامی ہے۔

مصطفیٰ پیدا ہوئے تو ترکی قوم مر رہی تھی۔ اُن کی پرورش کا زمانہ قوم کی زندگی اور موت کی کشمکش میں گزرا۔ جوان ہوئے تو قوم اس جان ہار کشمکش سے نڈھال ہو کر موت کی راہ تک رہی تھی۔ اس نازک وقت میں مصطفیٰ کمال نے قوم کو سنبھالا۔ اس کے مُردہ جسم میں نئی روح ڈالی۔ اس کی موت کو زندگی سے بدلا۔ اور نئی زندگی کو نیا قالب بھی دیا۔ وہ بوڑھی قریب مرگ قوم اب جوان ہے۔ اور آج جب وہ مر گئے تو اپنے پیچھے ایک زندہ اور توانا قوم چھوڑ گئے ہیں۔

عثمانی تُرک ریوڑ چراتے چراتے بادشاہ بن گئے۔ سلطان سلیم اور سلیمان کا دَور اُن پر ایسا بھی گزرا ہے کہ دُنیا کی کوئی طاقت اُن کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ سات زمین اور سات سمندر ان کے قبضے میں تھے۔ زمانہ بدلا تو یہ بھی بدل گئے۔ سلاطین عیاشی میں پڑ گئے۔ فوج بے سری رہ گئی۔ علم و تہذیب کے مالک خواہشات کے غلام بن گئے۔ عوام بے چارے بے زبان تھے۔ حکومت نااہلوں کے ہاتھ میں تھی اور ظلم و جبر اُن کا شعار تھا۔ اور کمزور طبقے کہ بُری طرح پیسے جاتے تھے۔

اُنیسویں صدی کے آغاز میں وطن پروروں کی ایک جماعت نے اپنی قوم کی بُری حالت کو درست کرنے کی کوشش کی۔ شروع شروع میں تو ان کی مساعی کامیاب ہونے لگیں لیکن جب عبدالحمید خلیفہ بنا۔ تو اُس نے اپنے لئے دستور کی قیود کو گراں جانا۔ اور ایک ایک کر کے اصلاح کے تمام کام بند کر دیئے۔ وطن پروروں کے لیڈر بے رحمت بُری طرح قتل ہوئے۔ اس کے بعد یہ ظالم سلطان ۳۳ برس تک برسر اقتدار رہا۔ اس طویل زمانے میں کونسا ظلم تھا جو اٹھا نہ رکھا گیا ہو۔ ضمیر و زبان کی آزادی جرم تھی۔ رشوت اور خوشامد حکومت کا دستور تھا۔ نااہلوں کو عہدے ملتے تھے اور ظلم کے خلاف آواز اُٹھانے والے قتل ہوتے یا جلا وطن۔ تعلیم گاہیں بند کر دی گئیں۔ آزادی پیدا کرنے والی کتابیں ممنوع تھیں۔ رعایا تباہ تھی۔ کوئی غیرت مند نوجوان جاسوسوں کے ہاتھ سے محفوظ نہ تھا۔

مُلک کی اس گری ہوئی حالت کو دیکھ کر یورپی حکومتوں نے سلطنت کے حصے بخرے
کرنے شروع کر دیئے۔ مصر برطانیہ نے دبا لیا۔ ٹیونس فرانس نے۔ بلقان کی ریاستیں ایک ایک
کر کے آزاد ہوتی گئیں۔ رُوس آئے دن قسطنطنیہ پر چڑھ دوڑتا تھا۔ خُود سلطنت کے اندر
جو عیسائی اقلیتیں تھیں۔ وُہ یورپی حکومتوں کی شہ پا کر ہر وقت آمادۂ فساد رہتی تھیں۔
سلطنت میں جو اجنبی آباد تھے وُہ ترکی قوانین سے بالا تھے۔ اُن کی دراز دستیاں ترکی
پولیس روک سکتی تھی اور نہ تُرکی حکومت۔ نہ وُہ حکومت کو ٹیکس دیتے اور نہ حکومت
اُن پر نگرانی کر سکتی۔ اگر ان میں سے کسی کو ذرا سی تکلیف پہنچ جاتی۔ تو اس کی اپنی حکومت
تُرکی کو ڈراتی، دھمکاتی اور اکثر اَوقات اعلانِ جنگ کر دینے پر اتر آتی۔ سلطنت دیوالیہ
ہو چکی تھی۔ قرضوں سے حکومت کا کاروبار چلتا اور ہر نئے قرض دینے والے کو ملک کا کوئی
نہ کوئی انتظامی شعبہ سونپ دیا جاتا۔ استبداد اور ذلت کی اس کے بعد اَور کیا حد ہو سکتی
تھی۔ سُلطان عبدالحمید کی خلافت اور سلطنت کا یہ عالم تھا لیکن وہ "ظلّ اللہ" کے نام سے
پُوجا جاتا تھا۔ محراب و منبر سے اس کی درازیٔ عُمر کی دُعائیں مانگی جاتی تھیں۔ مذہبی طبقے ان
مظالم کو دیکھتے تھے اور چُپ تھے۔ اسلام کے نام سے خلیفہ کی حکومت منوائی جاتی تھی اَور
اطاعتِ خلیفہ کو اطاعتِ خداوندی قرار دیا جاتا تھا۔

اس ظلم و جور، ذلت اور بے بسی کی فضا میں مصطفٰے نے آنکھیں کھولیں۔ باپ کا سایہ
بچپن سے سر سے اُٹھ گیا تھا۔ ماں نے مُلا کے پاس پڑھنے کو بھیجا۔ لیکن مصطفٰے کی سرکش
طبیعت اُستاد کی سختی کی متحمل نہ ہو سکی۔ اَور وہ مدرسہ سے نکل بھاگا۔ کچھ زمانہ ننھیال میں
آوارگی میں گزارا۔ پھر ایک فوجی مدرسہ میں داخل ہوا اور یہ بھگوڑا طالب علم اس مدرسے میں
آ کر سب سے قابل اور محنتی بن گیا۔ مدرسے سے مصطفٰے قسطنطنیہ کے فوجی کالج میں پہنچا جہاں

اپنی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے اپنے ساتھیوں میں نہایت عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا

نوجوان مصطفےٰ نے عجیب طبیعت پائی تھی ۔ اکثر وہ خاموش رہتا ۔ اپنے ساتھیوں سے بہت کم تعلق رکھتا ۔ سرکشی کا یہ حال کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا ۔ نہ کسی کو دوست بنانا پسند کرتا اور نہ کسی کا دوست بنتا ۔ ریاضی سے بہت لگاؤ تھا ۔ زندگی کے ہیجانی لمحوں میں کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا لیکن واقعیت پسند طبیعت کو جذبات کی یہ حرکت اچھی نہ لگتی ۔ بے چینی کا زمانہ تھا ۔ نوجوانوں کے خیالات میں انقلاب بپا تھا ۔ حکومت کی سختیاں اس انقلاب کی دبی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکانے کا کام کر رہی تھیں ۔ گو بات کرنا قانون نے بند کر دیا تھا لیکن دلوں پر کون پابندیاں عائد کر سکتا تھا ۔ برملا کہنے کی اجازت نہ تھی ۔ لیکن چوری چھپے کی سرگوشیوں کو بھلا کون روک سکتا تھا ۔ جہاں چند پڑھے لکھے جمع ہوتے قوم کی بدحالی اور حکومت کے ظلم و ستم کا ذکر ضرور ہوتا ۔ سازشیں کی جاتیں، خفیہ جماعتیں بنتیں اور انقلاب ان تمام روگوں کا علاج تجویز ہوتا ۔ بھلا قسطنطنیہ کا فوجی کالج اس رو سے کیسے بچ سکتا تھا ۔

مصطفےٰ کی سیاسی زندگی کا آغاز ان خفیہ جماعتوں سے ہوا ۔ وہ اور اس کے ساتھی استادوں کی نظر سے دور انقلاب کے منصوبے سوچتے، تجویزیں بناتے اور حکومت کا تختہ الٹنے کی راہیں ڈالتے تھے ۔ ان کی یہ سرگرمیاں بہت دنوں تک پوشیدہ نہ رہ سکیں اور راز افشا ہو گیا ۔ مقدمہ چلا ۔ قصور ثابت تھا ۔ سلطان نے رحم کھایا ۔ کسی سخت سزا دینے کی بجائے وطن سے دور فوج میں لفٹیننٹ بنا کر دمشق بھیج دیا ۔ یہاں آکر سیاسی جدوجہد کے لئے انہیں زیادہ آزادی ملی ۔ "وطن" نامی انجمن بنائی گئی ۔ اور فوج کے نوجوان افسروں کو اس میں شریک کیا گیا ۔ کچھ عرصہ بعد یہ دمشق سے تبدیل ہو کر سالونیکا پہنچے ۔ جو اس وقت

انقلابی جماعتوں کا مرکز تھا اور سالونیکا میں مصطفےٰ کمال انجمن اتحاد و ترقی کے سرگرم رکن بن گئے۔ اور انور اور جمال کے دوش بدوش کام کرنے لگے۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں نوجوان ترکوں نے سلطان عبدالحمید کو مجبور کردیا کہ وہ ملک میں دستوری حکومت قائم کرے۔ چنانچہ ترکی پارلیمنٹ بلائی گئی، اور ترکی نے استبداد اور شخصی حکومت کا جوا اپنے گلے سے اُتار پھینکا۔ عبدالحمید نے اپنا اقتدار بحال کرنے کی پھر کوشش کی۔ تو انہیں معزول کرکے نظر بند کردیا گیا۔ بوڑھے سیاست دان برطرف ہوئے اور نوجوان ترکوں نے سلطنت کی باگ ڈور خود سنبھالی۔

یہ نیا دور شروع ہی ہوا تھا کہ اٹلی نے طرابلس پر حملہ کردیا۔ ترک بے بس تھے۔ فوج کی کوئی بھی کل درست نہ تھی۔ سمندری بیڑا بھی نہ تھا کہ طرابلس کو مدد بھیجی جاسکتی۔ انور اور مصطفےٰ بھیس بدل کر کسی نہ کسی طرح طرابلس پہنچ گئے اور عربوں کی مدد سے حملہ آوروں کو روکنے کی کوشش کی۔ یہ جنگ ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ بلقانی ریاستوں نے قسطنطنیہ پر دھاوا بول دیا۔ ترک تیار نہ تھے لڑے تو وہ ضرور۔ لیکن ہر محاذ پر شکست کھائی۔ جن پر برسوں حکومت کی تھی۔ ان کے ہاتھوں سے ترکوں کو شکست کی ذلت اُٹھانی پڑی۔ ہزاروں گھر تباہ ہو گئے۔ ترک آبادی تلوار اور آگ کی مدد سے بلقان سے ختم کی جانے لگی۔ انور اور مصطفےٰ طرابلس سے واپس وطن پہنچے، اور ترکی کے تاریخی شہر ایڈریانوپل کے کھونے سے جو دھبہ لگا تھا۔ کم سے کم ان دونوں کی ہمتوں نے اس کالک کو دھونے میں بڑا کام کیا۔ آخر بڑی مشکلوں سے یہ جنگ بند ہوئی۔

اب سلطنت کے سیاہ و سفید کے مالک انور، طلعت اور جمال تھے۔ انہوں نے مصطفےٰ کمال سے جان بوجھ کر اعراض برتا۔ در اصل وہ انہیں اپنا حریف سمجھتے تھے۔ اور

نہیں چاہتے تھے کہ مصطفےٰ ایسی غیر معمولی صلاحیتوں کا آدمی ترکی سیاست میں کسی بڑے منصب پر فائز ہو۔ چنانچہ مصطفےٰ صوفیا کی ترکی سفارت کے ساتھ ملحق کر دئے گئے۔ مصطفےٰ کمال جیسی سرکش طبیعت اس حق تلفی کو کیوں نہ محسوس کرتی۔ لیکن ملک میں انور، طلعت اور جمال کی ہوا بندھ چکی تھی۔ اور قوم اُن کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہ تھی۔ یہ سرکش طالب علم جو ملّا کی سختی سے بھاگا تھا جس کو سلطان عبدالحمید کے مظالم نے کالج ہی میں باغی بنا دیا تھا۔ اور جس نے فوجی افسر ہونے کے بعد اس انقلابی تحریک کو اپنی جان پر کھیل کر منظم کیا تھا۔ اور پھر طرابلس اور بلقان میں بہت سے معرکے سر کئے تھے۔ اب اپاہج بنا کر صوفیہ میں ڈال دیا گیا۔ سرکشی، بغاوت، بے چینی، غیر معمولی ہمّت، اقدام اور ولولوں کی خاطر خواہ تسکین نہ پا کر معلوم نہیں مصطفےٰ کمال کے دل میں غصّہ، بغض اور نفرت کی کتنی سخت آگ نہ بھڑکی ہوگی۔ پنجرہ میں بند شیر جھلّا کر آخر کیا کچھ نہیں کرتا۔ مصطفےٰ کمال کو دل کی یہ آگ کسی نہ کسی طرح سے فرو کرنی تھی۔

دوستوں نے معرکہ ہائے کارزار میں بہادری اور جرأت کے جوہر دکھانے کا موقعہ نہ دیا۔
تو عیش و نشاط کی محفلوں پر تو کوئی روک نہ تھی۔ رزمگاہ کی جگہ بزم و سرور نے لے لی۔
اور تلوار اور بندوق کا دھنی ساغر و مینا میں پڑ گیا۔

۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم چھڑی اور ترکوں نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ مصطفےٰ جرمنوں سے خوش نہ تھے۔ اور انور سے اُنہیں نفرت تھی۔ جنگ زوروں پر ہو رہی تھی اور مصطفےٰ صوفیہ میں بیٹھے دل ہی دل میں کُڑھتے تھے۔ حکومت کو بارہا اپنی خدمات پیش کیں اور دوستوں سے بھی کہلوایا لیکن انور جواب وزیرِ جنگ تھے۔ اُنہیں صوفیہ میں رکھنے پر مُصر رہے۔
۱۹۱۵ء میں مصطفےٰ سخت بیمار ہوئے۔ موت اور زندگی کی کشمکش میں گرفتار قسطنطنیہ پہنچے۔ بیماری وہی تھی جس نے ۲۳ برس کے بعد ان کی جان لیکر چھوڑی۔ قسمت اچھی

تھی۔ موت کے منہ سے بچ نکلے۔ صحتیاب ہوئے اور انہیں درہّ دانیال کی حفاظت پر
متعین کیا گیا۔ برطانی فوجیں پوری طاقت سے درہّ دانیال پر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ اگر
اُن کا یہ حملہ کامیاب ہو جاتا۔ تو جنگ کا سارا نقشہ بدل جاتا، ترکی کے راستے رُوس
کو کمک مل جاتی۔ اور وہ یوں اتنی آسانی سے جرمنی سے نہ پٹتا، اور ادھر فرانس کے
محاذ پر جرمن فوجوں کا زور کم ہو جاتا اور لڑائی اتنا طول نہ کھینچتی۔ مصطفےٰ کمال کی بے نظیر
شجاعت اور جنگی مہارت کیا تھی، ایک معجزہ تھا کہ ترکوں کی بے بس اور تھکی ہوئی قوم نے
انگریزوں کو دانیال سے پسپا ہونے پر مجبور کیا۔ اب ترکی کے بچے بچے کی زبان پر مصطفےٰ کمال
کا نام تھا۔ لیکن حکومت کے مختارِ مطلق اپنے حریف کو آگے نہ بڑھنے دیتے تھے۔

جنگ کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اور جرمنوں کے قدم آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے
لگے۔ اب ترک بھی ہر محاذ پر شکست کھا رہے تھے۔ اسی زمانے میں عربوں نے بغاوت کر
دی۔ اس موقعہ کو برطانوی فوجوں نے غنیمت جانا۔ اور وہ عراق اور فلسطین کی راہ سے
ترکی پر پیش قدمی کرنے لگیں۔ اس نازک وقت میں سلطان کی طرف سے مصطفےٰ کمال
کو پروانہ ملا کہ فلسطین کے محاذ پر روانہ ہو جاؤ۔ یہ سمجھ گئے کہ حریف دوست درہّ دانیال
کی عظمت کے چاند کو اس شکست سے گہن لگانے کے درپے ہیں۔ مصطفےٰ کمال فلسطین
پہنچے۔ تو فوج کی حالت دگرگوں تھی۔ اور دشمن کسی طرح رُکتا نظر نہ آتا تھا۔ انہوں نے ادھر
اُدھر سے فوج کو سمیٹا۔ اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ فلسطین چھوڑا، دمشق چھوڑا،
حلب کے ایک دروازے سے نکلے تو دوسرے دروازے سے انگریزی فوجیں اور باغی عرب داخل
ہوئے۔ فتح کے نشے میں سرمست ہو کر آگے بڑھ جانا آسان ہے۔ لیکن پے در پے شکستوں اور
پیہم پسپائیوں کے بعد اپنے اوسان بحال رکھنا مصطفےٰ کمال ہی کا کام تھا، پیچھے ہٹتے ہٹتے

یہ ترکی کی موجودہ سرحد پر پہنچ گئے۔ اس جگہ پہنچ کر اُنہوں نے ترکی فوج کو حکم دیا، کہ اب کوئی قدم پیچھے نہیں اُٹھے گا۔ اور وطن کی مقدّس سرزمین دشمنوں کے قدم سے ناپاک نہیں ہونے دی جائیگی، اسی اثنا میں عارضی صلح کا اعلان ہوا، جنگ رُک گئی اور مصطفٰے کمال واپس قسطنطنیہ بُلا لئے گئے۔

سُلطان وحید الدّین نے اپنے بچاؤ کے لئے اتّحادیوں کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دیا تھا، دشمنوں کی ظفرمند فوجیں قسطنطنیہ پر قابض تھیں۔ اُن کے جنگی جہاز آبنائے باسفورس میں لنگر انداز تھے، ترکی قوم صدیوں کی جنگ سے پہلے ہی بدحال تھی، اس چار برس کی مصیبت نے اس کی زندگی کا آخری قطرۂ خون نچوڑ لیا تھا، ہر طرف مایوسی تھی، بڑے بڑے ہمت ہار چکے تھے، انجمن اتّحاد ترقّی کے لیڈر ملک سے باہر جا چکے تھے، اور اتحادیوں کی تلواروں تلے پُرانے رجعت پسند سیاست دان پھر برسرِاقتدار آ گئے۔ مصطفٰے ان سب سے الگ تھلگ تھے۔ انہوں نے سلطان کا دل ٹٹولا۔ لیکن وہ راضی بہ تقدیر ہو چکے تھے، پُرانے سیاست دانوں کو سمجھایا کہ یُوں ہمّت ہار دینا ترکی کو دشمن کا تر نوالہ بنانا ہے، لیکن اُن کی بات کسی نے نہ سُنی، لیکن نوجوان تُرک ابھی موجُود تھے، جن کی رگوں میں زندگی کا خُون دوڑ رہا تھا۔ مصطفٰے نے ان لوگوں کو یکجا کیا، اُن کی حُبِّ وطن کی آگ کو ہوا دی۔ یہ نوجوان سر جوڑ کر بیٹھے اور قوم کو موت سے بچانے کے لئے دوا دارو سوچنے لگے۔

مصطفٰے کمال کے دل میں تو یہ خیالات تھے، لیکن بظاہر اُن کی زبان بند تھی۔ سُلطان نے اُن کی اس خاموشی سے دھوکا کھایا، اور اُنہیں سلطنت کی مشرقی مقبوضات کا قائمہ اعلیٰ بنا کر انگورہ کی سمت روانہ کیا، تاکہ وہ عارضی صُلح کے مطابق فوج کو برخاست کر کے ہتھیار جمع کر

پس مصطفےٰ کو یہ موقعہ خُدا نے دیا۔ اُنہوں نے فوجوں کو برخاست کرنے کی بجائے اُلٹا انہیں منظم کرنا شروع کردیا۔ مصطفےٰ نے لوگوں کو اپنے گرد جمع کیا، اور اُنہیں بتایا کہ اگر ہم نے اس وقت اپنے آپ کو فاتح دشمنوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تو ہمارا حشر بہت بُرا ہوگا، یہ پکار جادُو کی تاثیر رکھتی تھی، تھکے ہارے سُننے ہی تازہ دم ہوگئے، جن کی ہمتیں بالکل جواب دے چکی تھیں، وہ مرنے مارنے پر تُل گئے۔ سلطنت کی ہر سمت سے جوق درجوق لوگ مصطفےٰ کمال کے پاس آنے لگے، فوجی افسر، پُرانے سپاہی، ماہر اخبار نویس، شاعر، ادیب جس کو موقعہ ملا۔ اور جس طرح ہوسکا انگورہ کی طرف کھنچا چلا آیا۔

سلطان وحید الدّین چونکے اور اتحادی گھبرائے۔ لیکن مصطفےٰ کمال ان کے چنگل سے نکل چکے تھے۔ وعدہ وعید اور دھمکیوں سے کام نکلتے نہ دیکھا، تو سلطان نے اتحادیوں کے کہنے میں آکر مصطفےٰ کمال اور ان کے ساتھیوں کو باغی قرار دیا۔ شیخ الاسلام نے اُنہیں کافر بتایا۔ اور خلیفہ کے جاں نثار اور "اسلام" کے سورما مجاہدوں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوئے، عین اُسی زمانے میں ورسائی کے عہدنامے کا اعلان ہُوا۔ اس کی رُو سے ترکی کے سب عربی صُوبے اس سے چھین لئے گئے۔ قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا قبضہ تسلیم کیا گیا۔ سمرنا کا علاقہ یونانیوں کو بخشا گیا، اور انگورہ کے لق ودق بنجر حصے ترکوں کے حصے میں آئے۔ اس خبر نے کمالی تحریک کو جو ابھی بمشکل سنبھلنے نہ پائی تھی۔ کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ انگورہ میں ترکی اسمبلی کی بُنیاد رکھی گئی، اور خلیفہ کے احکامات کو اس بنا پر ماننے سے انکار کردیا گیا کہ وہ اپنے آپ کو دُشمنوں کے ہاتھ میں دے چکے ہیں۔

یونانی سمرنا پر قابض ہوئے تو اُسے تباہ وبرباد کردیا، وہاں سے یہ لوگ آگے بڑھے برطانیہ کی شہ تھی، اور پرانی یونانی امپائر کے خواب انہیں ستا رہے تھے۔ بڑھتے بڑھتے

اور ترکی فوجوں کو آگے سے ہٹاتے یونانی نئے پایۂ تخت انگورہ تک پہنچ گئے۔ سقاریہ کے میدان میں ترک اور یونانی ایک دوسرے کے مقابل ہوئے۔ ۲۱ دن کی سخت جنگ کے بعد ترکوں کو فتح حاصل ہوئی۔ اور یونانی فوجوں نے ایتھنز جا کر دم لیا۔ اب ترک قسطنطنیہ کی طرف بڑھے۔ چنانچہ برطانی فوجوں کے رُو در رُو ترک سپاہی کھڑے نظر آئے، لائڈ جارج برطانیہ کے وزیر اعظم تھے وہ تو لڑنے کو تیار تھے، لیکن برطانی قوم نے ساتھ نہ دیا۔ آخر صُلح کی طرح ڈالی گئی اور لوزان کے معاہدے میں کمالی ترکوں کے تمام مطالبات مان لیے گئے۔

قسطنطنیہ پر از سرِ نو پرچم ہلال لہرانے لگا۔ آبنائے باسفورس سے دشمنوں کے جہاز نکل گئے، اجنبی مراعات ختم کر دی گئیں۔ یورپ کا "مردِ بیمار" تندرست اور توانا ہو گیا۔ یہ ایک معجزہ تھا جو بات کسی کے خیال میں نہ آ سکتی تھی اُسے مصطفیٰ کمال نے واقعہ کر دکھایا! الغرض ترکی نے اس کے طفیل نئی زندگی پائی۔

نئی زندگی اپنے لئے نیا جسم بھی چاہتی ہے۔ ترک دشمنوں سے تو بچ نکلے تھے لیکن اُن کا جسم قومی انحطاط اور زوال کے مواد سے بھرا ہوا تھا۔ سالہا سال کی پے در پے جنگوں نے مُلک کا بُرا حال کر دیا تھا۔ تجارت اور صنعت باہر والوں کے ہاتھ میں تھی۔ زراعت کرنے والے بارہ مہینے بندوقیں اُٹھائے پھرتے تھے۔ امیر طبقے مال مست تھے وہ قومی زندگی کی مشکلوں کو داد عیش دے کر کم کرتے تھے۔ حکمران طبقوں کو صدیوں کے استبداد نے بیکار کر دیا تھا۔ تعلیم تھی تو واجبی علماء ہر ترقی کے دشمن، اور ہر پُرانی چیز کے شیدا اور اس کو برقرار رکھنے کے لئے وطن اور قوم کو بیچنے کے لئے تیار۔ صوفیا خانقاہوں اور تکیوں میں وظائف کرنا سب سے بڑی نیکی سمجھتے تھے۔ نئی زندگی جو برسوں کی جان توڑ کوششوں، خوں ریزیوں، بغاوتوں اور جنگوں کے بعد ملی تھی کس طرح ترکی قوم کے اس فرسودہ اور لاغر جسم میں سما سکتی تھی۔

اب اگر اس زندگی کی نشوونما ضروری تھی تو جسم کا بدلنا اُس کے لئے لازمی تھا۔

مصطفےٰ کمال نے جس سنگدلی اور سفاکی سے طرابلس اور بلقان کی جنگیں لڑیں، درہ دانیال میں برطانیہ کو ہٹایا، اور سقاریہ میں یونانیوں کو شکست دی، وُہی روح اب ترکی قوم کے لئے نئے جسم کی تعمیر میں کارفرما ہوتی ہے۔ قوم کی بے حسی اور بے بسی جب سپاہی کو مجبور کرتی ہے کہ وُہ دشمنوں کے خُون میں نہا کر اپنی قوم کی رہنمائی بھی کرے تو اس سے اعتدال پسند مُصلح اور پھُونک پھُونک کر قدم رکھنے والے قائد کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔ مصطفےٰ کمال نے جس سختی کے ساتھ دشمنوں کے سر کچلے تھے اُس سختی کو اپنے اِن دوستوں کے خلاف استعمال کرنے میں بھی اُسے باک نہ تھا، جو اُس کے نزدیک وطن کے لئے باہر کے دشمنوں سے کم خطرناک نہ تھے۔

ترکی قوم کو مصطفےٰ کمال نے نئی زندگی دی، اس سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اُس نے اس نئی زندگی کو نیا قالب بھی دیا، جس کے حُسن و قبح پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اگر مصطفےٰ کمال ترکی کے لئے یہ نیا قالب تیار نہ کرتا تو قوم کی صدیوں کی فرسودہ روایات، مذہبی توہمات اور علمائے مذہب کی تنگ دلی اور جہالت اور عوام میں اُن کی ہردلعزیزی، یہ سب چیزیں اس نئی رُوح کو کبھی کا ختم کر ڈالتیں۔ مصطفےٰ کمال نے اپنی اصلاحوں سے اس نئی زندگی کو اُبھرنے کا موقع دیا۔ وُہ اُبھری اور ممکن ہے اپنی پُرانی زنجیروں کو توڑ کر وہ بعض بعض باتوں میں غلط راہ پر چل بھی نکلی ہو۔ لیکن اس بے راہ روی سے غلط فہمی نہ ہو، غلط راہ پر چلتے چلتے صحیح راہ پر آ جانا کوئی بڑی بات نہیں لیکن جو زمین پر پاؤں نہ ٹکا سکے وہ چلے گا کیا؟ مصطفےٰ کمال نے خلافت کے ڈھونگ کو ختم کیا۔ یہ لوگ "ظل اللہ" کے نام سے پکارے جاتے تھے، اور "خشکی و تری" پر اُن کا سکہ

چھپا تھا. لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا وجود سرتاپا بے کار ہو چکا تھا۔ یہ اجنبی کے سایے کا ناپا کرتے۔ اور وقت پر دشمن ان کو آسانی سے خرید بھی لیتے تھے۔

مصطفےٰ کمال نے ترکی علما کا زور توڑا۔ جو قوم کے لئے وبال بن چکے تھے تعویذ دینے والے پیر، قبر پرست مجاور، زاویہ نشین صوفی اور بھک منگے فقیر جو قوم کے خون کو جونک کی طرح چوس رہے تھے ختم ہوئے. عوام جیس اور جاہل تھے ان کو علم کی روشنی اور وطن کی محبت اور خیر خواہی کا جذبہ دیا، خلیفہ اور حکومت کا مذہب گو اسلام تھا، لیکن ان کے سب کام غیر اسلامی ہوتے تھے، مصطفےٰ کمال نے اس اشتہار کو بیکار رکھ کر حکومت کو مذہب کے اس مفت کے دُم چھلے سے نجات دی، اور ترکی حکومت کے لادینی اصولِ سیاست سے فائدہ اٹھا کر ترکی میں عیسائی مشنریوں کی مذہبی سرگرمیوں کا سدِ باب کر دیا۔ اُن کے ابتدائی مدرسے بند اور اُن کے تمدنی اقتدار کو جو قوم کے ضمیر کو برسوں سے خراب کر رہا تھا، ختم کیا۔ روس سے قومی بیر چلا آتا تھا، اُس سے دوستی کی، لیکن اس دوستی کے باوجود اشتراکیت کے اثرات کو ملک میں آنے نہ دیا۔ یونان ہٹ چکا تھا، لیکن اس سے بھی صلح صفائی کر کے راہ و رسم بڑھائی، برطانیہ سے اچھے تعلقات قائم کئے. فرانس پر زور ڈال کر اپنے مطالبے منظور کرائے اور اس طرح خارجی سیاست میں امن اور آشتی پیدا کی۔

ترک زراعت سے غافل تھے، اُنہیں زراعت پر لگایا، زراعتی تعلیم کو عام کرنے کے لئے مدرسے اور کالج بنائے صنعت و حرفت کا ترکوں میں نام تک نہ تھا قانون کے زور سے اُنہیں ان کاموں میں لگایا۔ تجارت بیشتر یونانیوں کے ہاتھ میں تھی۔ کمالی حکومت نے سب یونانیوں کو دیس بدر کیا، اور اس طرح ملک سے ہمیشہ کے لئے

اقلیتوں کا جھگڑا پاک کر دیا۔ تعلیم کو ترقی دی۔ بچوں اور نوجوانوں میں قومی کاموں کا احساس پیدا کیا، عورتیں زندگی سے دُور گھر کی چار دیواری میں قید تھیں انہیں رسمی پردہ سے نکالا اور کاروبار زندگی میں لگایا۔ پُرانی چیزوں کو محض پُرانی ہونے کی وجہ سے مقدّس مانا جاتا تھا، اس کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا کیا۔ ترکی ٹوپی بدلی۔ یورپی لباس ضروری قرار دیا۔ نقاب اُلٹا، ترکی زبان لاطینی حروف میں لکھی جانے لگی۔ عاجزی اور نیازمندی کے پُرانے آداب بدلے۔ موسیقی کو جو محض رونے دھونے کے جذبات کو اُبھارتی تھی۔ زندگی بخش طرز میں ڈھالا۔

مصطفےٰ کمال سرکش تھے! اور بہت سخت قسم کے سرکش، ان کے ارادے اٹل تھے، اور جو کوئی اُن کی راہ روکتا، اُن کے انتقام کی آگ اُسے بھسم کر دیتی۔ وہ باغی تھے۔ بچپن سے باغی۔ جوانی میں حریفوں کی رقابت نے اُنہیں اور باغی بنا دیا، اور جب حقیقی معنوں میں کام کرنے کا وقت آیا۔ تو سلطان وحیدالدّین کی حرکتوں نے بغاوت کی اس آگ کو اور بھی تیز کر دیا۔ اگر اس سرکش اور باغی کو صحت بخش اور ترقی پسند ماحول ملتا۔ اور اس ماحول میں اُسے اپنی غیر معمولی قوت، جرأت اور دیگر صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے مواقع ملتے رہتے تو یہ باغی اور سرکش شائد اتنا سخت باغی اور سرکش نہ ہوتا۔

مصطفےٰ کمال کی بڑائی اس کی اپنی بڑائی ہے۔ اور اُس کی کمزوریاں اس کے ذلیل اور پست ماحول کا نتیجہ تھیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مصطفےٰ کمال اگر اتنا سرکش اتنا باغی، اتنا خودسر اور اتنا سخت نہ ہوتا۔ تو قوم کے ان صدیوں کے پُرانے قالبوں کو جو تقدس کا درجہ اختیار کر چکے تھے وہ بدل بھی نہ سکتا۔ اس مردِ غازی کی ایک ضربِ کلیمی نے ملّت کے تمام بُتوں کو توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا۔ اور اس کی مثال اور اس کا پیدا

کیا ہوا ولولہ آج ہر مسلمان نوجوان کو اپنے اپنے ماحول میں اس ضربِ کلیمی کو آزمانے کی دعوت دے رہا ہے۔

غازی مصطفےٰ کمال صحیح معنوں میں بڑے آدمی تھے۔ انہوں نے صدیوں کے جمود کو توڑا۔ وہ جمود جس نے اسلام کی اصل رُوح کو مسخ کر دیا تھا۔ اُن کی بغاوت اور اُن کے کُفر نے آئندہ نسلوں کو کافر ہونے سے بچا لیا۔ ورنہ اگر یہی حالت رہتی تو نئی نسلوں کا انقلاب، ان کی اُمنگیں، اُن کی آرزوئیں، ان کی بے قراریاں مسلمانوں کے اس فرسودہ اور بے رُوح قالب کو دیکھ کر کب مطمئن ہوتیں۔ مصطفےٰ کمال کے "کفر" نے نہ معلوم کتنوں کو کافر بننے سے بچا لیا۔ یہ "کافر" واقعی مردِ مومن تھا۔ جو خود جلا اور اپنی ذات سے اُفقِ اسلام کو روشن کر گیا۔

مولانا محمّد علی

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال ہوا۔ اور اُس کے پُورے پچاس برس بعد پلاسی کی جنگ لڑی گئی، جس نے اس سرزمین میں برطانی تسلط کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ ہندوستان کے تخت و تاج کے وارث گو ایک اور صدی تک مسلمان ہی رہے، لیکن اُن کی یہ "صاحب قِرانی" صرف نام کی رہ گئی تھی۔ در حقیقت عالمگیر کے مرتے ہی مسلمانوں کے آفتابِ اقبال کو گہن لگنا شروع ہو گیا تھا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت حاکموں کی تھی۔ اور اب تک اُن کی بُری بھلی جو بھی جمعیت تھی، وہ محض حکومت کے دم سے تھی۔ صدیوں کی شان و شوکت کے بعد حکمران طبقے کشور کشائی اور جہانبانی کے جوہرِ اصلی کھو بیٹھے۔ عوام مسلمان تو پہلے سے ہی ان سے بے تعلق اور اُن کی سرگرمیوں سے ایک حد تک غافل تھے۔ ان میں نہ تو کسی سیاسی وحدت کا شعور تھا، اور نہ ایک ملّت میں ہونے کا ذہنی احساس

جو افراد کو ایک رشتے میں پروئے رکھتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کا انقلاب آیا اور مسلمانوں کے حکمران طبقے بحیثیت ایک با اقتدار اور سیاسی جماعت کے ناپید ہو گئے، تو یہ عوام بھی ریت کے ذرّوں کی طرح ہوا میں اُڑتے نظر آنے لگے۔ شاہ جہان آباد کے قلعۂ معلیٰ سے آخری مغل تاجدار کے رخصت ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اب ہندوستان سے مسلمانوں کا شاہی دَور ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے۔ جب شاہی دَور ختم ہوا، تو ظاہر ہے اس کے اساس پر مسلمانوں کی جو سیاسی اور ملّی تنظیم تھی وہ کیسے قائم رہ سکتی تھی۔

سر سیّد احمد خاں نے نئے سرے سے مسلمانوں کو ایک قوم اور ایک ملّت کے شیرازے میں جمع کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ اس وقت مسلمانوں کی بڑی زبون حالت تھی۔ اُن کے اعلیٰ طبقے جن پر کسی قوم کی معاشی آسودگی اور علمی و فکری قیادت کا دار و مدار ہوتا ہے بیشتر تعداد میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی بھینٹ چڑھے۔ ان میں سے جو بچ رہے تھے۔ وہ فاتح قوم کی انتقام جوئی کے لرزہ خیز واقعات کو دیکھ کر دم بخود تھے، اور اُنہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا کہ وہ کیا کریں۔ مسلمان خواص پر تو یہ اُفتاد پڑی۔ اور ان کے عوام میں سرے سے اِتنی سکت ہی نہ تھی کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے۔ یا اعلیٰ طبقوں کے مٹ جانے سے جو جگہ خالی ہوتی اُس وقت اُسے بھر لیتے، اور اس طرح قومی زندگی میں جو رخنہ پیدا ہوا تھا اس کا سدِّ باب ہو جاتا۔ یہ تو ایک مصیبت ہوئی۔ دُوسری مُصیبت یہ تھی کہ سب خُون خرابہ کرنے کے باوجود بھی حکومت مسلمانوں سے ہنوز خفا تھی۔ اور اب تک اُس کا غصہ فرو نہ ہوا تھا، اور پھر سب سے بڑھ کر ہندوستانی مسلمانوں کو اس آفت کا بھی سامنا کرنا تھا کہ وہ اس ملک میں کروڑوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود بھی اقلیت میں تھے۔ اور

ملک کی اکثریت اگر اُن کی دشمن نہیں تو دوست بھی نہ تھی۔ اور خاص طور پر اُن کا بھلا اس میں تھا کہ نئے حکمران مسلمانوں سے خفا ہی رہیں۔ تاکہ اس طرح صرف وہی حکومت کی عنایات کے مرکز بن سکیں۔

سرسید نے ان تمام مصیبتوں کا علاج تعلیم کو قرار دیا۔ ایسی تعلیم جو رعایا کو حاکموں کے علوم اور اُن کی زبان سے بہرہ ور کر دے۔ سرسید نے اپنی تمام زندگی اس مقصد کے لئے وقف کر دی۔ اُس زمانے میں اور اُن حالات میں وہ سیاست میں صلح جویانہ حکمت عملی پر مجبور رہے بے حس اور اپاہج قوم کو جسے صحیح معنوں میں قوم کا لقب بھی نہ دیا جاتا تھا، سیاست کی پیچ در پیچ اور دشوار گزار وادیوں میں چلانا تدبر اور دانشمندی سے بعید تھا۔ سرسید کی اس سیاسی حکمت عملی کی ضرورت مسلمانوں کے ہر طبقے نے اس وقت تسلیم کی اور سرسید کے دینی، تمدنی، اور علمی افکار سے مخالفت کے باوجود سب نے اُن کے اس تدبر اور اصابت رائے کو مانا۔
۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی بنیاد رکھی گئی۔ اور اس طرح قوم کے اس ابراہیم نے ملت کے لئے ایک نیا کعبہ تعمیر کیا۔ وہ نظریں جو صدیوں سے قلعۂ معلیٰ کی طرف دیکھتی چلی آتی تھیں، اور اب کوئی مرکز نہ پا کر آوارہ اور پریشان تھیں، اس نئے قبلے کا طواف کرنے لگیں۔
الغرض اس طرح سرسید کے ہاتھوں ہماری قومی زندگی کی ایک نئی طرح پڑی اور ان کے بعد ان کے جانشینوں نے اپنے مرشد کے بتائے ہوئے راستے پر اس زندگی کی تشکیل میں بڑے خلوص اور سرگرمی سے کام کیا۔

بچپن میں تو سرپرستوں کی احتیاطیں اکثر ٹھیک ہوتی ہیں، لیکن سن شعور میں بچے کے لئے یہ مہرداری اور محبت پدری تکلیف کا موجب بھی بن جاتی ہے۔ سرسید کے بعد اُن کے جانشینوں کا دور آیا۔ تو مسلمانوں کی نئی نسلیں پیدا ہو رہی تھیں۔ گرد و پیش کی فضا اور

خود اُن کی اپنی زندگی اُن سے ہاتھ پاؤں مارنے کا تقاضا کرتی اور وہ نئے ولولے اور حوصلے اپنے اندر پاتے لیکن جب وہ اپنے سامنے زندگی کے سب دروازے بند دیکھتے، تو گھبرا اُٹھتے۔ اور اُن کی زبان وقلم سے بسا اوقات اُن کے دلی اضطراب اور بے تابی کا اظہار ہو جاتا۔ بوڑھے ان نوجوانوں کو عافیت کوشی اور امن وآشتی کا درس دیتے اور ان کی اس بے صبری اور بے تابی پر ناک بھوں چڑھاتے۔ وہ اپنی ان باتوں میں سرسید کی مصلحت پسندانہ حکمت عملی سے دلیل پکڑتے تھے، اور نوجوانوں کی آزاد خیالی کو خام کاری کا نتیجہ بتاتے تھے۔ ان بوڑھوں کی بات کو ٹالنا اتنا آسان نہ تھا۔ یہ قوم کے بڑے مخلص اور جفاکش خادم تھے۔ ان کی عمر بھر کی بے لوث خدمات نے قوم کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

ایک طرف عقیدت اور ان بوڑھوں کی خدمات کا تقاضا تھا کہ نوجوان دبکے بیٹھے رہیں، اور خاموشی سے بزرگوں کے راستے پر چلتے جائیں۔ اور دوسری طرف آزادیٔ فکر اور ذوقِ عمل کا جذبہ سرتابی اور بغاوت پر ابھارتا تھا۔ ملتِ اسلامیہ کے ضمیر میں یہ کشمکش اندر ہی اندر موجزن تھی کہ محمد علی کا وجودِ گرامی منصۂ شہود پر آتا ہے۔ "ایک بیدار ہونے والے ملک، ایک خوابِ گراں سے جاگنے والی ملت کی ساری بے تابی، سارا ذوق شوق، ساری سرگرمی، ساری خود فراموشی اس ایک پیکر میں جلوہ گر تھی۔" محمد علی کے ظہور سے ملتِ اسلامیہ کو ایک تازہ ولولۂ حیات ملا۔ یاس و حرمان، بزدلی اور کم ہمتی، جوش و خروش بے باکی اور جفا طلبی میں بدلی۔ ۱۸۵۷ء کے خونی انقلاب کے ڈرے ہوؤں کی قیادت ختم ہوئی۔ اور نوجوانانِ ملت کارزارِ زندگی میں صف آرا ہوئے۔ دراصل یہاں سے ہماری سیاسی تاریخ میں محمد علی کا دور شروع ہوتا ہے۔

محمد علی طالب علم ہی تھے کہ بڑے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتے۔ انگریز افسروں کی

تحکمانہ نگاہیں اُنہیں سرکشی پر آمادہ کرتیں، حاکمیت کا جلال اُن سے نہ دیکھا جاتا۔ کسی کی بات کو دل سے مانے بغیر اُسے قبول کرنا محمد علی کی فطرت کے خلاف تھا۔ سِنِ شعور کے آٹھ برس محمد علی نے علی گڑھ میں گزارے۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں آپ نے علی گڑھ سے بی۔اے کیا۔ اور اس کے بعد پہلی بار انگلستان کا احرام سفر باندھا۔ اُس وقت موصوف کی عمر ۱۹½ برس کی تھی۔ ابھی ابھی کالج سے نکلے تھے۔ سول سروس کے امتحان میں شرکت کا ارادہ تھا اس زمانے میں یہ امتحان صرف انگلستان میں ہوتا تھا۔ اور کئی سال کی تیاری اور بہت روپیہ خرچ کرنے کے بعد اس میں کامیابی کی اُمید ہو سکتی تھی۔ محض بڑے بھائی شوکت علی کی غیر معمولی ہمت اور ایثار تھا۔ کہ محمد علی اس کٹھن مہم پر روانہ ہو سکے۔

محمد علی اس مرتبہ ساڑھے تین برس کے قریب انگلستان میں رہے۔ زندگی کی دلچسپیوں کی ظاہر ہے وہاں کوئی کمی نہ تھی۔ اور مرحوم طبیعت کے زاہد مشرب بھی نہ تھے۔ جوانی اور تندرستی حُسن صورت اور حُسن کلام، مزاج آتشیں، دل میں جذبات کا ایک طوفان اور اس پہ دیارِ حُسن کی آب و ہوا اتنی سازگار، مگر عجیب بات یہ ہے کہ مرحوم کے خود اپنے الفاظ میں "کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شاہدانِ اصلی کی کمی نہ تھی مگر ذوق نظارہ جمال لاکھ سہی۔ اور گرہ میں مال بھی سہی، تاہم طبیعت کا میلان خلاف دستورِ عام زہد و تقویٰ کی طرف رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ طلب علم کے شوق کے سامنے دوسرے شوق دب گئے۔ اور ۳½ سال کا یہ زمانہ جو محمد علی کی اس عمر میں طوفانِ نوح سے کم کیا ہوگا تحصیلِ علم کی سرگرمیوں میں صرف ہوا۔ اتفاق کیئے کہ اس کے باوجود محمد علی سول سروس کے امتحان میں ناکام رہے۔ اور آخر گھر والوں کے اصرار پر وطن لوٹے۔

ریاست رامپور میں کچھ عرصہ محکمۂ تعلیم کا افسر رہنے کے بعد سنہ ۱۹۰۲ء میں دوبارہ

انگلستان جانا ہوا۔ مقصد یہ تھا کہ آکسفورڈ میں اپنی تعلیم کمل کریں - مرحوم کا زیادہ تر قیام اس دفعہ آکسفورڈ میں رہا۔ اور آخر میں نہایت امتیاز کے ساتھ بی۔اے (آنرز) کی سند لے کر آئے۔ ہندوستان آنے پر ریاست بڑودہ میں بہت اچھے عہدے پر فائز ہوئے اور وہاں سات سال تک بڑی نیک نامی سے ریاست کی خدمت کی لیکن آخر بڑودہ ایک ہندو ریاست تھی اور پھر اس کی فضا بھی محدود اور یہاں نوکری کا معاملہ۔ مرحوم کی طبیعت ایک بیکراں سمندر۔ کڑھتے بگڑتے کبھی کبھی افسروں سے بھی اُلجھ پڑتے۔ جواب طلب ہوتا، تو یہ بہت سختی سے جواب دیتے۔ بہرحال اس طرح کب تک کام چلتا اور محمد علی کب تک ضبط کرتے۔ آخر ریاست کی نوکری چھوڑ دی۔

اس زمانے میں بھی فکر معاش کی یہ پابندیاں محمد علی کو قومی اور ملی سرگرمیوں سے باز نہ رکھ سکیں۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی طرح پڑی۔ تو لیگ کے دستور اساسی کی تشکیل میں محمد علی کا بھی ہاتھ تھا۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ جو اس وقت حقیقت میں ہندوستان کے مسلمانوں کی نئی نسلوں کے لئے شاہ رگ کا حکم رکھتا تھا، بدقسمتی سے تمام تر اجنبی افراد کے اثر میں تھا۔ یہ نونہالانِ ملت کے دلوں کو شروع ہی سے حاکموں کی برتری اور اُن کی ہیبت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا عادی بناتے تھے۔ لیگ بنی تو اس کے کرتا دھرتا بھی علی گڑھ کالج کے انگریز پرنسپل اور اُن کے ہم مشرب رفقائے کار ہوئے۔ محمد علی بڑودہ میں بیٹھے ہوئے یہ رنگ دیکھتے اور پیچ و تاب کھاتے۔ وہ اخبارات میں اس کے متعلق مضمون لکھتے دوستوں کو اس "انگریز گردی" کے خلاف اُکساتے جب کبھی ان کا علی گڑھ میں آنا ہوتا، تو پرانے اور نئے طلبہ کو اس غلامی کی رضامندی پر شرم دلاتے۔ گو نواب محسن الملک سے محمد علی کو بڑی عقیدت تھی لیکن کالج و قوم کی ذلت کو دیکھ کر وہ ضبط نہیں کر سکے۔ چنانچہ ایک خط میں

نواب صاحب کو لکھتے ہیں "کالج اور قوم کی وفات پر "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن" پڑھ کر دو چار آنسو بہا لیتا ہوں۔ بہتر ہے جو کچھ ہوا۔ ہوا۔ اب آپ اس مُردہ قوم کو اُس کے حال پر چھوڑ دیں۔ اور اپنی بوڑھی ہڈیوں کو آرام دے لیں"۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں محمد علی بڑودہ کی نوکری چھوڑ کر کلکتہ پہنچے۔ اور وہاں سے ہفت روزہ انگریزی اخبار "کامریڈ" نکالا۔ حکومت ہند کے دفاتر کلکتے سے دہلی آئے، تو یہ بھی "کامریڈ" کو دہلی سے نکالنے لگے۔ اور اس کے ساتھ ایک اُردو کا روزنامہ "ہمدرد" بھی جاری کر دیا۔ ہندوستان کی اسلامی سیاست کا یہ طوفانی عہد تھا۔ نوجوان پود انگریزی حکومت کے جوتے کو ناقابلِ برداشت پا رہی تھی۔ بوڑھے سلامت روی پر مصر تھے۔ سیاسی مجالس اور اخبارات کا لہجہ بدل چکا تھا۔ تحریر و تقریر کی گرمی طبیعتوں کو اُبھار رہی تھی۔ محمد علی نے "کامریڈ" اور "ہمدرد" اسی غرض سے نکالے تھے کہ صحافت نگاری کے ذریعہ اپنی قوم اور وطن کی خدمت کر سکیں۔ چنانچہ وہ اور اُن کے یہ دو نو صحیفے شروع ہی سے ایک طرف علی گڑھ کالج کو اصلاح و ترقی اور اُسے کالج سے یونیورسٹی بنانے کی جدوجہد میں کوشاں تھے، تو دوسری طرف وہ مسلم لیگ کو صحیح معنوں میں ایک آزاد سیاسی جماعت کی حیثیت دینے میں سرگرمِ عمل تھے۔ انہی دنوں کانپور میں ایک مسجد کے معاملہ میں صوبجاتِ متحدہ کی حکومت نے نہتے بے گناہ مسلمانوں پر گولی چلا دی۔ اس پر تمام ملک میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک کہرام مچ گیا۔ یہ سنہ ۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے۔ اس سے پہلے طرابلس اور بلقان کی جنگوں کی وجہ سے بھی ہندوستانی مسلمانوں میں انگریزی حکومت کے خلاف کافی بیزاری پیدا ہو چکی تھی۔

اس زمانے میں محمد علی تیسری بار انگلستان گئے۔ اور اپنے ساتھ مسلم لیگ کے سیکرٹری سید وزیر حسن کو بھی لیتے گئے۔ سفر کی غرض یہ تھی کہ کانپور کے حادثے سے مسلمانانِ ہند میں عام

طور پر ناراضگی پھیل چکی تھی، اس سے برطانیہ کے اربابِ اقتدار کو باخبر کریں۔ اور نیز طرابلس اور بلقان کے معاملے میں ترکوں سے جو بے انصافی کی گئی تھی، اور پھر جزیرۃ عرب کو ہتھیانے کے لئے خفیہ خفیہ جو تدبیریں ہو رہی تھیں، اس مسلم آزار برطانی حکمت عملی کے نتائج بد سے حکومت کو متنبہ کریں۔ محمد علی نے انگلستان پہنچ کر اس سلسلہ میں برطانی مدبّروں سے ملاقاتیں کیں۔ آپ نے عام جلسوں میں تقریریں بھی کیں لیکن سب نے سُنی اَن سنی کر دی۔ اور محمد علی ایک حد تک ناکام واپس آئے۔

۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہوئی۔ تو انگریزی حکومت کے لئے ایسے سرکش باغی کو آزاد رہنے دینا کیسے گوارا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے محمد علی، ابوالکلام اور اُن جیسے اور خطرناک مسلمان قائدوں کو نظر بند کر دیا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک جنگ عظیم کا سلسلہ جاری رہا۔ جنگ ختم ہوئی تو ہندوستان میں ایک نئے انقلاب کا آغاز ہوا جنگ کے دوران میں ہندوستان نے برطانیہ کی ہر طرح سے مدد کی تھی۔ اور گو مسلمان اس وجہ سے کہ برطانیہ ترکوں کے خلاف لڑ رہی تھی۔ بے حد خفا تھے۔ لیکن چار و ناچار وُہ بھی جنگ کے زمانے میں بحیثیت مجموعی خاموش ہی رہے لیکن فتح و کامرانی کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں کی اعانت کا بدلہ یُوں دیا کہ ترکوں کی سلطنت کے حصّے بخرے کرکے اپنے اور اپنے حلیفوں کے درمیان بانٹ لئے۔ اور ہندوستان میں رولٹ ایکٹ نافذ کرنے کی ٹھانی۔ اس پر احتجاج ہوا۔ تو پنجاب میں انسانیت سوز مظالم کئے گئے۔

دُنیائے اسلام اور ہندوستان کی یہ حالت تھی کہ محمد علی قیدِ فرنگ سے نکلے۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں لیگ اور کانگرس کے سالانہ اجتماع ہو رہے تھے کہ وہ سیدھے امرت سر پہنچے، اور پہلی بار انہوں نے کانگریس میں شرکت کی۔ اس وقت خلیفۃ المسلمین اتحادی فوجوں کی

حراست میں تھے۔ اور اتحادی سیاست دان ترکی قوم کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے منصوبے کر رہے تھے۔ محمد علی ہندوستانی مسلمانوں کا ایک وفد لے کر انگلستان گئے۔ اور حکومت برطانیہ کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ اگر ترکوں کے ساتھ برطانیہ اور اس کے ساتھیوں نے یہ سلوک روا رکھا، تو اس کا اثر ہندوستان کے مسلمانوں پر بہت برا پڑیگا۔ اور بادشاہ معظم کی یہ "وفادار ہندوستانی رعایا" جو کچھ بھی اس سے بن آئیگا کر گزریگی، یہ وفد تقریباً آٹھ ماہ تک یورپ میں رہا، محمد علی نے اپنی آواز سیاست اور حکومت کے بڑے بڑے ایوانوں میں پہنچائی۔ لیکن برطانیہ اور اس کے فاتح حلیف غرور فتح میں سرمست تھے۔ اور ظاہر ہے شادی کے شادیانوں میں کسی بے کس ستم زدہ کی آہ دردناک، کون سنتا ہے ۔
محمد علی یورپ سے دل شکستہ ہوئے۔ اور یہ ٹھان کر لوٹے کہ بقول ان کے "دریوزہ گران خلافت، خالی کاسۂ گدائی لے کر یورپ سے لوٹے، مگر اس کا تہیہ کر کے کہ یہاں تمام حجت تھا۔ اس کے بعد یورپ کے سامنے ہرگز ہاتھ نہ پھیلائیں گے۔ اگر قوت نہ ہوگی تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا تک پسند کریں گے مگر یورپ کے آگے ہاتھ جوڑنا پسند نہ کریں گے۔ کھلا ہاتھ نہ بڑھے گا بلکہ بندھی ہوئی مٹھی سے کام لیا جائیگا۔"

اس کے بعد فوراً خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ ان ہنگاموں میں دو تین برس تک وہ جوش و خروش رہا کہ ہندو مسلمان کی تمیز اٹھ گئی، مسلمان ہزاروں کی تعداد میں کانگرس میں شریک ہوئے۔ اور ہندوؤں نے خلافت کی تحریک میں مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ اس زمانے میں تمام سیاسی سرگرمیوں کے محمد علی جواب مسٹر محمد علی سے رئیس الاحرار مولینا محمد علی بن چکے تھے، گویا کہ روح رواں تھے۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ اب ایک پیہم حرکت تھی۔ جہاں جاتے دلوں میں آگ لگا دیتے

اُن کی تقریریں نوجوانوں کو جنون و شوق کے نشے میں سرشار کر دیتیں۔ بوڑھے اُن کے الفاظ کے تیر و نشتر سے بلبلا اٹھتے۔ ہندوستان ایک ماتم کدہ بن گیا جس میں مولانا محمد علی کی دلخراش صدائیں ہر کونے اور ہر سمت میں سنائی دیتی تھیں۔

۱۹۲۱ء میں پھر گرفتار ہوئے۔ دو برس قید خانے میں گزار کر باہر آئے تو ہندوستان کا نقشہ بدل چکا تھا۔ ہندو مسلمان وطن کی آزادی اور انگریز کی مخالفت میں یک جان و یک قالب ہونے کی بجائے باہم دست و گریباں نظر آئے اور حالت یہاں تک پہنچی کہ ہندوستان میں کوئی شہر ایسا نہ بچا، جہاں ہندو مسلم بلوے نہ ہوئے ہوں۔ محمد علی نے ایک شیر دل فاتح کی طرح ان سیاسی جھگڑوں کا مقابلہ کیا۔ شروع شروع میں اُس کے ساتھ کافی لوگ تھے لیکن آہستہ آہستہ ساتھیوں کا یہ مجمع چھٹتا چلا گیا۔ وہ چلاتا تھا، اور کوئی سنتا نہ تھا۔ مسلمان خفا تھے کہ وہ ہندوؤں کی پاسداری کرتا ہے، ہندو بیزار تھے کہ محمد علی ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کا نام الاپتا ہے۔ لیکن یہ اپنی دُھن کا پکا جو بات وہ اپنے نزدیک حق سمجھتا تھا، بے رو رعایت برملا کہتا۔ اور کسی کی پروا نہ کرتا بیگانے تو پہلے ہی سے ناراض تھے۔ اس دوران میں اندرونِ ہند اور بیرونِ ہند میں بعض نئے مسائل اور بھی پیدا ہو گئے۔ جن کی وجہ سے بعض اپنے بھی محمد علی کے سخت دشمن بن گئے۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم مسئلہ حجاز میں ابن سعود کی حکومت کا تھا۔

محمد علی اس طرح فرسا اور یاس انگیز زندگی سے گھبرایا نہیں۔ وہ مخالفتوں اور مصیبتوں میں ہمت ہارنے کو گناہ سمجھتا تھا وہ اپنوں سے لڑا، بے گانوں کے خلاف برابر نبرد آزما رہا۔ اپنے دشمن ہو گئے۔ اور بے گانوں نے اُسے بدنام اور ناکام کرنے کی ہر تدبیر کی، لیکن اس باہمت جواں مرد کی جبین پر شکن تک نہ آئی۔ اور وہ آخر دم تک اپنوں اور

بے گانوں کا نہایت پامردی سے مقابلہ کرتا رہا۔ لیکن ہُوا یہ کہ آخر میں اُس کی صحت نے جواب دیا۔ اور ساتھ ہی اُسے مالی پریشانیوں نے بھی بُری طرح سے آن گھیرا۔ "کامریڈ" بند ہُوا اور "ہمدرد" پر بھی سکرات کا عالم طاری ہو گیا۔ مرحوم کی صحت پہلے ہی کب اچھی تھی۔ ان تفکرات نے مدافعت کی قوت اور کمزور کر دی۔ چنانچہ ذیابیطس کا زور ہُوا اور جان کے لالے پڑ گئے۔

جون ۱۹۲۹ء میں علاج معالجے کے ارادے سے مولانا محمد علی یورپ تشریف لے گئے۔ وہاں سے لوٹے تو صحت قدرے بہتر تھی۔ لیکن ہندوستان واپس آتے ہی پھر سیاست کی بھنور میں پھنس گئے۔ اب کہ معرکہ بہت سخت تھا۔ اور اپنے بہت سے ساتھی حریف جماعت میں شامل تھے۔ محمد علی کو شکست دینا تو محال تھا۔ لیکن مخالفتوں کا سیلاب ایسا نہ تھا کہ کسی کے تھامے تھمتا۔ محمد علی نے مسلمان قوم کو اپنا ہم خیال بنانے کے لئے اپنی پوری قوت صرف کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرحوم کی صحت پھر گری اور ایسی گری کہ محمد علی چند دن کا مہمان سمجھا جانے لگا۔

سن ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس کا لندن میں انعقاد ہُوا۔ کانگرس بڑی سختی سے اس میں شرکت کے خلاف تھی۔ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت بھی اس امر میں کانگرس سے متفق تھی۔ محمد علی شرکت کے حامی تھے۔ دونو فریق زور آزمائی پر تُل گئے۔ محمد علی نے اپنے ہم خیالوں کو سمیٹا۔ اور مرتے مرتے بھی ہر محاذ پر مخالفتوں کا مقابلہ کیا لیکن جسمانی قوائے ایک ایک کر کے جواب دے رہے تھے۔ آنکھوں کی بینائی تقریباً ناپید ہو چکی تھی۔ خون کا دباؤ ہر دم موت کو دستک دیتا۔ لیکن اس نازک حالت میں بھی وُہ لندن کو روانہ ہو گئے۔

مولانا محمد علی کا یہ سفر اُن کے آخری سفرِ حیات کا بھی پیش خیمہ بنا۔ یہ مولانا کو گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت نہ تھی، بلکہ یہ اُن کے لئے موت کی دعوت تھی، جو کسی حیلے سے نہ ٹلی۔ دوستوں نے اُنہیں سفر سے روکا۔ عزیزوں نے سمجھایا۔ لیکن اُنہیں نہ ماننا تھا اور وہ نہ مانے۔ چنانچہ اس موقعہ پر وہ اپنے ایک مخلص دوست کو لکھتے ہیں "شدّ رحال" اب تو میرے مذہب میں گول میز کانفرنس ہی کی شرکت کے لئے جائز رہ گیا ہے"۔

مولینا کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ اس حالت میں یورپ کا سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی اُنہوں نے یہ سفر کیا۔ مولینا کے اس فیصلہ کے کیا اسباب تھے، یہ خود مولینا کی اپنی زبان سے سُنیئے۔ روانگی سے قبل ایک خط میں اپنے عزمِ سفر کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:۔

"پاؤں میں پہلے ہی حس نہ تھا اب حالت کچھ بدتر ہی ہے اور سردیوں میں ہر وقت گنگرین ...... یا اُن کی قطع و برید اور اس طرح موت کا اندیشہ رہے گا۔ اب تک صاحبِ فراش ہوں کانفرنس کے روزانہ اجلاس میں نہ صرف ہندوؤں اور انگریزوں بلکہ سب سے زیادہ خود مسلمان بھائیوں سے ایک ایک نقطے پر جنگ کرنی پڑیگی۔ ان تین محاذوں پر جنگ کرنے میں ہر وقت دل کی حرکت یکایک بند ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ سب سے زائد یہ کہ اب لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ کامل نابینائی کا ماہر علاجِ چشم نے پورا یقین دے دیا ہے کہ اگر میں سب کام چھوڑ کر نیپال جیسے ملک کو نہ چلا جاؤں جہاں دنیا کی کوئی خبر نہ ملے۔ لیکن اس پر بھی میں سمجھتا ہوں کہ میرا مذہبی فرض ہے کہ اس کانفرنس

میں شریک ہوں اور وہاں سلطان جابر اور رعایائے جابر دونوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر سب سے افضل جہاد کروں تاآنکہ اس کام میں نہ مرجاؤں"۔
آخر اکتوبر ۱۹۳۰ء میں مرحوم اس سفر کو نکل کھڑے ہوئے۔ بڑی مشکل سے اُن کو جہاز پر سوار کرایا گیا۔ راستے میں برابر غش پر غش آتے رہے۔ پیرس پہنچے تو یکبارگی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ دوا دارو ہوا تو موت کے مریض نے قدرے سنبھالا لیا۔ اور مرحوم پیرس سے لندن روانہ ہوگئے۔ گول میز کانفرنس ہوئی اور وہ اس میں شریک بھی ہوئے۔ اور تقریر بھی کی، اور جو بات کہنی تھی، سب سے کہی۔ اور جب موت کا فرشتہ آیا تو جانِ زار محمد علی ہندو مسلم سمجھوتے کے متعلق اپنے خیالات قلمبند کروا رہے تھے۔ اُن کے جی کو یہ بات لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح ہندو مسلمانوں میں سمجھوتہ ہو جائے۔ اور سب مل جل کر متحدہ طور پر برطانیہ کے سامنے آزادی کا مطالبہ پیش کریں۔ آخر وقت تک وہ اس جدوجہد میں منہمک رہے۔ اُن کی ہمت اٹل تھی۔ اور ان کا ایمان لازوال۔ ناممکن تھا کہ یہ شعلہ موت سے بجھ سکتا۔ لیکن بدن پر موت کا وار چل گیا۔ محمد علی کے جسمِ خاکی کے عناصر اُس کے ایمان اور اس کی ہمت کا ساتھ نہ دے سکے، گو آخری لمحہ تک اُن کے ہوش و حواس برقرار رہے لیکن دماغ کی خون کی رگیں پھٹ گئیں۔ اور ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کی رات کو محمد علی نے اپنی جان جانِ آفرین کو سونپی۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

مولانا محمد سورتی

علیگڈھ سے خبر ملی ہے کہ جامعہ کے پُرانے اُستاد اور عربی زبان کے مشہور ادیب مولانا سید محمد سورتی صاحب انتقال فرما گئے۔ موصوف کو اِدھر چند برسوں سے استسقا کا عارضہ تھا۔ پچھلے دنوں معلوم ہوا تھا کہ اب اُن کی صحت اچھی ہے۔ لیکن پھر یکبارگی اطلاع آئی کہ مولانا نے سفرِ آخرت اختیار فرمایا۔

مولانا محمد سورتی صاحب کے انتقال سے عربی علم وادب کی دُنیا کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ عربی ادب میں تو موصوف کے پایہ کا ہندوستان تو کیا شاید ساری عربی دُنیا میں کوئی عالم نہ تھا۔ مرحوم کا مطالعہ بڑا وسیع تھا اور نظر بڑی دقیق۔ عربی زبان کی شاید ہی کوئی قابلِ لحاظ تصنیف ہوگی جو مولانا کی نظر سے نہ گذری ہو۔ موصوف صرف کتابی عالم نہ تھے بلکہ صاحبِ تحقیق بھی تھے۔ عربی ادب پر ان کو کُلی احاطہ تھا۔ جاہلی اور اسلامی دَور کے تمام مشہور شعراء کے ہزارہا اشعار

زبان زد تھے۔ مرحوم کا شعر کا مذاق بڑا پاکیزہ تھا۔ اور ہمیشہ بڑے اصرار سے شاگردوں کو اپنی پسند کے شعرا کا کلام پڑھاتے اور مطلق اس کی پروا نہ کرتے، کہ مدرسے کے مجوزہ نصاب میں وہ حصہ موجود بھی ہے یا نہیں۔ پڑھاتے پڑھاتے اگر کوئی غیر معمولی عمدہ شعر آجاتا تو مولینا اُچھل پڑتے اور بار بار جھوم کر اسے دُہراتے اور اتنے محظوظ ہوتے کہ طالب علم بے ساختہ اس شعر کی داد دینے لگتے۔ مولینا کو علم حدیث سے بھی بہت لگاؤ تھا۔ بخاری کے رجال پر بڑی بصیرت سے محاکمہ کیا کرتے تھے۔ موصوف گو مذہباً اہلِ حدیث تھے۔ لیکن اصولِ فقہ پڑھنے کی بڑی تلقین فرمایا کرتے۔ اُندلس کے مشہور ظاہری عالم ابنِ حزم سے مرحوم کو بڑی عقیدت تھی اور ایک زمانے سے اُن کے متعلق عربی میں ایک ضخیم کتاب بھی لکھ رہے تھے۔ دراصل مولانا کا مسلک قدیم عُلمائے اہل حدیث کا تھا۔ جو قیاس کے مقابلہ میں حدیث کو ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ تقلید و عدم تقلید اور فقہ و حدیث کی لفظی بحثوں سے اُن کا دامنِ علم ہمیشہ الگ رہا۔

سچ تو یہ ہے کہ حدیث اور علومِ دینیہ سے مولانا کا شوق ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ موصوف کا اپنا مضمون عربی ادب تھا۔ چنانچہ عربی ادب ساری عمر اُن کا اوڑھنا بچھونا رہا۔ ادب میں مولانا کا اپنا ایک خاص مسلک تھا۔ خالص اور بے میل عربی زبان کے وہ عاشق تھے۔ شعر کو وہ شعر ہی کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ شعر میں معمے اور پہیلیاں کہنے کے وہ سخت خلاف تھے۔ اسی لئے عہدِ جاہلیت کے شعرا کا کلام ان کو سب سے زیادہ پسند تھا، اور ان میں بھی جو شاعر صحرائی اور بدویانہ زندگی میں زیادہ رچا ہوا ہوتا، مولینا کا ربط اس سے اور بھی زیادہ ہوتا۔ عہدِ امویہ کے شعرا کو بھی وہ غنیمت مانتے تھے، اور عباسیوں کے ابتدائی عہد کے شروع شروع

کے شعرا بشار اور ابونواس وغیرہ کو بھی وہ پڑھانا منظور کر لیتے تھے لیکن بعد میں ادب کے تکلف و تصنع کے دور کے اہلِ علم اور ارباب شعر کی تصنیفات کو پڑھانا وہ کبھی گوارا نہ کرتے۔ صرف و نحو اور معانی و بلاغت کے علوم میں بھی ان کا نظریہ سادگی پسند تھا۔ وہ تکلف اور پیچیدگی کو خواہ وہ شعر میں ہو یا نثر میں، نحو کے قاعدوں میں ہو یا استعاروں یا تشبیہوں کی قسموں میں، دل سے ناپسند کرتے تھے تعجب یہ ہے کہ مولانا مرحوم کو عام طور پر رجعت پسند سمجھا جاتا تھا اور ان کا سارا ذخیرۂ علم بھی زیادہ تر قدیم طرز کا تھا لیکن اس کے باوجود موصوف کا ادب و شعر کا مذاق عہدِ حاضر کے مصری اور شامی اربابِ نقد سے بہت کچھ ملتا تھا۔

راقم الحروف کو دورانِ قیامِ مصر میں عربی زبان کے سب سے مشہور ادیب اور نقاد ڈاکٹر طٰہٰ حسین عمید جامعہ مصریہ کے لیکچروں کے سننے کا اتفاق ہوا جو وہ جامعہ اور بیرونِ جامعہ میں اکثر دیا کرتے تھے۔ میری حیرت کی انتہا نہ پوچھیے جب میں نے "تجدید و تفرنج" کے اس امام کو جو پیرس یونیورسٹی کا ڈاکٹر ہے، اور اپنی قدامت دشمنی کی وجہ سے بہت بدنام ہے، ادب و شعر اور علوم معانی و بلاغت اور صرف و نحو کے متعلق کم و بیش وہی باتیں کہتے سنا جو دو برس پہلے ہندوستان میں مولانا سورتی جیسے قدامت پسند اور بقول شخصے "کٹ ملا" سے جامعہ ملیہ کے درسوں میں سن چکا تھا۔

مولانا کا وطن سورت تھا۔ صغر سنی میں علم کی کشش انہیں دہلی کھینچ لائی۔ مرحوم کبھی کبھی شاگردوں کو اپنے بچپن کے حالات سنایا کرتے، فرماتے تھے کہ "ہم توکل بخدا دہلی کے ارادے سے گھر سے نکل پڑے۔ زادِ راہ ہمارے ساتھ صرف اللہ کا نام تھا۔ سورت سے دہلی تک کا اکثر راستہ پیدل طے کیا۔ دہلی پہنچے تو ایک مدرسہ میں جگہ

مل گئی۔ ان دنوں کتابیں خریدنا ہماری بساط میں نہ تھا۔ ہم یہ کرتے کہ جس کتاب کی ضرورت پڑتی۔ اس کی نقل کر لیتے۔ اور اکثر تو کتابیں ہمیں ازبریاد ہو جاتی تھیں۔ اس زمانہ میں چاندنی چوک سے نہر بہتی تھی۔ اور اسٹیشن کے پاس کی زمین میں سایہ دار درخت کثرت سے تھے۔ ہم سارا سارا دن درختوں کے نیچے مطالعہ میں گزار دیتے۔ پڑھنے سے جی اُکتا تا تو دریا پر تیرنے چلے جاتے۔ چنانچہ تیرنے میں ہمیں اتنی مہارت ہو گئی تھی کہ بھرے دریا میں تیرا کرتے تھے۔" مولینا کہتے تھے کہ اوّل اوّل برسوں تک ہم پڑھا کئے۔ ہم محنت سے اپنے سبق بھی یاد کر لیتے۔ اور کتابیں بھی ہمیں حفظ یاد ہو جاتیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہم یہ سب ایک فرض سمجھ کر کیا کرتے تھے۔ علم کی لذّت جو ہمیں بعد میں حاصل ہوئی۔ اس سے ہم شروع میں عرصہ تک بے بہرہ رہے۔ بعد میں جب کامل اُستادوں سے پڑھا۔ تو پھر محسوس ہوا کہ علم کی لذّت کیا ہے اور ادب میں کیا لطف ہے۔"

مولنا نے دہلی، ٹونک اور رام پور کے مدرسوں سے بہت کچھ حاصل کیا۔ لیکن ان کے فضل و کمال میں زیادہ تر حصہ ان کے اپنے ذاتی مطالعہ اور شب و روز کی محنت کا ہے۔ ایک زمانہ میں موصوف حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے ہم سبق بھی رہ چکے تھے۔ حکیم صاحب مرحوم مولینا کی علمیت کے بڑے معترف تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں جب علی گڑھ میں جامعہ کی بنا رکھی گئی۔ تو حکیم صاحب کے بلانے پر مولنا جامعہ میں تشریف لائے۔ اور عربی ادب کی اعلیٰ تعلیم ان کے سپرد کی گئی۔ مولانا جامعہ میں سب کے مخدوم و محترم تھے۔ ان کے شاگرد تو ان کی عزت کرتے ہی تھے، لیکن دوسرے طلبا، اور اساتذہ بھی ان کی بزرگی کا بڑا خیال رکھتے، مولنا بڑے سخت متشرع تھے۔ اور عام نشست و برخاست اور وضع قطع میں ذراسی بھی بے راہ روی ان کو کھلتی تھی۔ چنانچہ اکثر مولانا

ایسی باتیں دیکھ کر بگڑ جاتے اور اپنا ڈنڈا اُٹھا لیتے۔ جامعہ کے خورد و کلاں اُن کی
طبیعت سے واقف تھے۔ چنانچہ مولینا کے عتاب پر ان کی گردنیں جھک جاتیں۔
اور انہیں مجبوراً آئندہ احتیاط کا وعدہ کرتے بنتی۔ جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ
سب کے سب مولانا کی ان باتوں کا بُرا نہیں مناتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مولینا
صاف دلی سے سب کچھ کہہ رہے ہیں۔ مرحوم دراصل ان کردہات کو دل سے سخت
ناپسند کرتے تھے۔ اور چونکہ وہ سب جامعہ والوں کو اپنا سمجھتے تھے اس لئے برملا اور
بے دھڑک جو محسوس کرتے کہہ دیتے۔ اس میں نخوت یا تکبر کی بو نہ ہوتی تھی اور نہ کسی
پندارِ زہد کا مظاہرہ۔ یوں بھی مولینا بڑے خوش طبع تھے۔ چھوٹے بڑوں سے گھل
کر ملتے۔ ہر ایک سے اپنایت برتتے۔ اور جامعہ کی برادری میں وہ یوں معلوم ہوتے
تھے کہ گویا وہ بزرگ خاندان ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ جامعہ والے ان کو یوں مانتے بھی تھے

جامعہ جب دہلی آئی تو کچھ عرصہ کے بعد بعض مجبوریوں کی بنا پر انہیں جامعہ سے
الگ ہونا پڑا۔ وہ مجبوریاں ایسی تھیں کہ اُن کا مداوا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ مولانا
دل سے نہیں چاہتے تھے کہ وہ جامعہ سے جائیں، اور نہ جامعہ والوں کو مولینا کی علیحدگی
گوارا تھی۔ لیکن حالات پر کسی کا زور نہیں ہوتا۔ مولانا جامعہ سے چلے گئے۔ لیکن
جامعہ کو بھولے کبھی نہیں، جب کبھی وہ دلی تشریف لاتے جامعہ میں ضرور آتے۔ مقبول
حسینوں یہاں ٹھہرتے تھے اور اُن کے آنے کے ساتھ جامعہ میں پھر پچھلی صحبتیں تازہ ہو
جاتیں۔ مولینا کی وہی ڈانٹ ڈپٹ برہمی اور عتاب اور اُن کے شاگرد جو اب
خیر سے جامعہ میں اُستاد بن چکے ہیں۔ نیازمندی میں آنکھیں نیچی کر لیتا اور گردن جھکا
لیتا۔ مولینا کی ذات بڑی بابرکت ذات تھی۔ اُن کے اُٹھ جانے سے علم و ادب

کو جو صدمہ ہوا، وہ تو ہوا لیکن جامعہ کی برادری کو بھی ان کی وفات سے کچھ کم
نقصان نہیں پہنچا۔ مولانا کی ذات ایسی تھی جس کی ہم سب عزت کرتے تھے، ایسے
شخص جماعت میں بہت کم ہوتے ہیں اور ان میں سے کسی کے گزر جانے کا صدمہ واقعی بڑا جانکاہ ہوتا ہے۔

مولانا نے کوئی قابلِ ذکر تصنیف نہیں چھوڑی وہ مطالعہ میں اتنے منہمک رہتے تھے
کہ تصنیف کے خیال کی انہیں کبھی فرصت نہ ملی۔ معلومات کا ذخیرہ اتنا وسیع تھا کہ اسے
سمیٹنے کی اور اسے ترتیب دے کر کتاب کے قالب میں ڈھالنے کی کبھی کوشش نہ کی۔
ابن حزم پر انہوں نے کچھ لکھا تھا۔ لیکن شاید ہی اسے کوئی شائع کرنے۔ لیکن مولانا کا قابلِ
فخر کارنامہ ان کی مشہور کتابوں کی تصحیح ہے جن میں سے بعض حیدرآباد سے چھپ چکی
ہیں، مرحوم قدیم کتابوں کے بڑے پرکھنے والے تھے۔ جامعہ میں آنے سے پہلے ان کا یہی
مشغلہ تھا، پرانی کتابوں کی تلاش میں وہ کتب خانوں کو چھانتے پھرتے اور اگر کہیں
انہیں کوئی نادر چیز مل جاتی تو اسے حاصل کرتے، اسے دیکھتے بھالتے، اس کی تصحیح کرتے۔
چنانچہ بڑے بڑے معاوضہ پر سرکاری کتب خانے ان سے یہ نادر نسخے خریدتے تھے۔
مولینا کا اپنا ذاتی کتب خانہ بھی تھا جس میں امید ہے بڑی نایاب اور نادر کتابوں کے
نسخے ہوں گے۔ مولینا کو کتابوں سے عشق تھا، اچھی کتاب کے حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ
فروگذاشت نہ کرتے تھے۔

الغرض مولینا ایک خوش طبع اور زندہ دل بزرگ تھے۔ اور عربی کے ایک بے نظیر عالم
اور محقق، علم کے سچے عاشق اور قدیم اسلامی تصنیفات کے بہترین ناقد اور واقف کار۔
ان کمالات کے حامل اب کہاں ملتے ہیں۔ بے شک مولینا ایسے بزرگ اور عالم کا
انتقال صحیح معنوں میں ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ کسی نے کتنا ٹھیک کہا ہے،
موت العالِم موت العالَم (صاحب علم کی موت ایک عالم کی موت ہے)۔

چودھری اکبر علی مرحوم

موت کسی عمر میں آئے اور بے تعلق سے بے تعلق آدمی کو آئے کسی کے مرجانے کا سُن کر ہمارے دل کو ایک بار تو ضرور دھکا لگتا ہے اور ہماری نظروں میں خود اپنی زندگی بلکہ ساری کی ساری دُنیا تاریک دکھائی دینے لگتی ہے لیکن جب موت کسی ایسی زندگی کو ختم کر دے جس کے زندہ رہنے پر صرف اُس کے خاندان اور مخصوص احباب کی زندگی کا دارومدار نہ ہو بلکہ اس کے دم سے جماعت کے بیسیوں کام چلتے ہوں اس کے حسنِ اخلاق کا سکّہ ہر دل پر نقش ہو۔ اُس کے علم سے طالبانِ علم اپنی تشنگی بجھائیں۔ اس کی فرزانگی اور تدبر سب کے کام آئے۔ وہ جس مجلس میں بیٹھے ہر شخص یہی چاہے کہ وہ وہاں سے کبھی نہ اُٹھے۔ وہ جب باتیں کرے تو سب کے دلوں کی کلیاں کھِل جائیں۔ اس کی صحت و تنومندی ضرب المثل ہو علم و حکمت کی صحبتوں میں وہ پیش پیش نظر آئے۔ شعر و نغمہ کا باب کھُلے۔ تو سب کی نگاہیں اُس کی طرف

اُٹھیں۔ تدبیرِ امور اور نظم و نسق کا سوال آئے تو اس کی رائے کا ہر ایک کو خیال ہو۔ ورزش اور کسرت کے مقابلے ہوں تو وہ سب میں آگے ہو۔ تیراکی کے معرکوں میں اس کا نمبر سب سے اُوپر ہو۔ الغرض ہر کام میں اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہو اور ہر جگہ اس کی غیر حاضری لوگوں کو کھٹکے۔ وہ اپنے آپ سے زیادہ اوروں کے لئے جیئے۔ اور یہ اور چند گنتی کے لوگ نہ ہوں بلکہ اُس کے سارے جاننے والے ہوں۔ ایسے ہمہ گیر صاحبِ دل و دماغ انسان کی موت کے صدمے سے جسے سُن کر بیگانوں کے سانس رُک جاتے ہیں۔ اُس کے جاننے والوں اُس کے ساتھیوں، اس کے احباب، اس کے بزرگوں اور اس کے بوڑھے ماں باپ، جوان بھائی اور نئی بیاہتا بیوی پر کیا گذری ہوگی، اُس کے تصوّر سے رُوح کانپ جاتی ہے۔ اس صدمہ کی المناکی اس خیال سے اَور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اکبر صاحب ابھی ابھی زندگی کے اُس مقام پر پہنچے تھے جہاں دل اور دماغ کی صلاحیتیں اپنے پُورے عروج پر ہوتی ہیں۔

خُدا کے فضل سے اکبر صاحب کی صحت ہزاروں کے لئے قابلِ رشک تھی۔ وہ محض کتابوں کے شیدا نہ تھے بلکہ کسرت کا بھی اُنہیں غیر معمولی شوق تھا۔ اُن کے قُوائے اتنے مضبوط تھے کہ ناواقف دیکھتا تو اُنہیں پہلوان سمجھتا۔ صحت کا ان کو اس قدر خیال تھا کہ کھانے پینے اور دوسرے معمولات میں حد درجہ احتیاط برتتے۔ ان کا علمی مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ لیکن اس کے ساتھ انہوں نے جسم کی بھی خوب نگہداشت رکھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس عمر میں جب کہ انہوں نے تعلیم اور تعلیم کے بعد ابتدائی تجربوں سے فارغ ہو کر عملی زندگی کے ایک وسیع دائرہ میں قدم رکھا تھا ان کی صحت بہت اچھی تھی اور وہ سخت سے سخت کام کرنے کی پُوری استعداد رکھتے تھے۔ برسوں

کے مطالعہ اور تربیت کے بعد خدا نے ریاست رام پور میں ان کو کام کرنے کا ایک بڑا
اچھا موقع عنایت فرمایا۔ ان کے سامنے ایک وسیع میدانِ عمل تھا۔ دل میں بڑے بڑے
ولولے تھے۔ دماغ میں سنجھی ہوئی عقل اور تجربوں پر کسی ہوئی سمجھ کی فراوانی تھی۔ بازوؤں میں
ہمت تھی۔ اُن کی صحت کا تو کیا کہنا۔ اس بھرپور جوانی میں جبکہ اکبر صاحب کی ہر صلاحیت
اپنے کمال کو پہنچ چکی تھی۔ موت نے ان کے فیوض سے ان کے ساتھیوں، جامعہ کی
برادری اور ریاست رام پور کو ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا۔ جن لوگوں کو اکبر صاحب
کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا ہے یا جن بزرگوں کے ساتھ اکبر صاحب نے کام کیا ہے
یا اُن کے وہ احباب جو ان کی دلی اُمنگوں اور آرزوؤں کو جانتے ہیں وہی اس بات
کا اندازہ کرسکتے ہیں کہ اُن کی بے وقت موت نے جامعہ اور رام پور کی زندگی میں کتنا
بڑا رخنہ پیدا کر دیا ہے جس کا بھرنا شاید ہی ممکن ہو۔

اکبر صاحب جامعہ سے بی اے کر کے انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ وہاں سے آپ
نیویارک گئے اور کولمبیا یونیورسٹی میں تعلیم مکمل کی۔ امریکہ کے دورانِ قیام میں آپ کو
۱۸ ماہ تک نیویارک کے سب سے بڑے ہسپتال میں موت وحیات کی کشمکش سے
عہدہ برآ ہونا پڑا۔ فرماتے تھے کہ بچپن میں کہیں گھوڑے سے گرا تھا اس وقت تو کچھ
محسوس نہ ہوا، لیکن بعد میں اس چوٹ نے ناسور کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ نیویارک
میں ۱۸ ماہ تک اس کی وجہ سے موت سے بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ قسمت اچھی تھی۔
کہ وہاں کے ڈاکٹروں کے لاعلاج بتانے کے باوجود بچ گئے۔ اور دیارِ غیر میں موت
نہ آئی۔ اس بیماری نے گو پیٹ کی جلد کو چھلنی چھلنی کر دیا تھا لیکن صحت کے
بحال ہوتے ہی اکبر صاحب پھر پہلے کی طرح تومند اور مضبوط ہو گئے۔

امریکہ سے لوٹے تو اپنی مادرِ علمی کی خدمت میں لگ گئے۔ چنانچہ جامعہ کے مدرسہ ابتدائی کی نگرانی آپ کے سپرد کی گئی۔ ایک برس کے بعد مدرسہ ابتدائی دریائے جمنا کے کنارے جامعہ نگر کی نئی عمارتوں میں منتقل ہوا تو اکبر صاحب جامعہ نگر اپنے مدرسے کو لے کر یوں پہنچے جیسے کوئی ملاح سمندر کے طوفان کا مارا ہوا کسی جزیرے میں جا نکلے۔ اور وہاں اُسے از سرِ نو زندگی کی تعمیر کرنی پڑے۔ مدرسہ ابتدائی کی عمارت ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہیں کہیں چھتیں پڑ رہی تھیں۔ کواڑ تو شاید ایک بھی نہ لگا تھا، اتفاق سے اس سال بارش بھی زیادہ ہوئی۔ اور پھر ارد گرد چاروں طرف جنگل تھا اور آس پاس کے لوگ نئے آنے والوں سے بالکل نامانوس تھے۔ عمارت ناکافی، بارش حد سے زیادہ، ملیریا پھیلا، اور خوب پھیلا، چھوٹی عمر کے بچے، عمارت کے ذرا باہر جائیں تو سانپوں کے غول رینگتے نظر آئیں اس پر ہر وقت چوروں کا خطرہ، اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جامعہ کی مالی حالت سقیم، اتنے دام کہاں کہ ضرورت کا سارا سامان ایک دم مہیا کیا جائے۔ استادوں کو کئی کئی ماہ تک پیسے کی شکل دیکھنا نصیب نہ ہوتی۔ اس بے سروسامانی کے باوجود اور ان بُرے حالوں میں بھی یہ وحشت زا فضا اکبر صاحب کے دم سے مسرت زار بنی ہوئی تھی۔ اساتذہ اتنے خوش و خرم نظر آتے کہ قرول باغ والے اُن کے ساتھی اُن پر رشک کرتے۔ چھوٹے بچے جامعہ نگر کی زندگی کے شوق میں گھروں کو بھول جاتے، شکار، سیر و تفریح، تیراکی اور کھیلوں کے آئے دن کے مقابلے اس جنگل کو یہاں کے رہنے والوں کے لئے پُر رونق آبادیوں سے زیادہ دلکش بنا رہے تھے۔ اکبر صاحب نے جامعہ نگر میں صرف مدرسہ کی زندگی کو بہتر نہ بنایا بلکہ انہوں نے آس پاس کے دیہات میں جو چودھری تھے، ان سے تعلقات استوار کئے، وہاں کی غمی خوشی

میں جاتے۔ ان کی شادیوں میں شریک ہوتے اور نیوتے ڈالتے۔ اکبر صاحب کو اس زمانے میں جب کوئی چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیلتا دیکھتا تو وہ انہیں بھی ایک بچہ سمجھتا۔ بچے ان سے اتنے مانوس تھے۔ کہ شاید وہ اپنے والدین سے بھی نہ ہوں۔ وہ اُن کی اُنگلیاں پکڑ لیتے۔ ان کے کندھوں پر سوار ہو جاتے۔ کوئی شکایت ہوتی تو سیدھے اُن کے پاس پہنچتے۔ دن ہو یا رات کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ کسی بچہ کو کوئی ضرورت پڑے، اور اکبر صاحب وہاں موجود نہ ہوں۔ اساتذہ کی مجلس میں اکبر صاحب ایک بے تکلف دوست کی حیثیت میں چھپاتے نظر آتے۔ وہ مدرسہ کے صرف ہیڈ ماسٹر نہ تھے بلکہ وہ ہر اُستاد کے دلی دوست، ہر مشورہ میں ان کے شریک اور ہر کام میں ان کے ہمدرد تھے۔ وہ تعلیمی معاملات میں ان کی رہنمائی کرتے۔ علمی گفتگوؤں میں ان سے استفادہ کیا جاتا۔ نجی امور میں اکبر صاحب سے رائے لی جاتی۔ یہاں تک کہ کپڑوں، کتابوں اور عام زندگی کے معاملات میں ہر شخص اکبر صاحب سے استصواب کرنا ضروری سمجھتا۔ اور پھر اکبر صاحب جامعہ نگر کے قرب و جوار کے دیہات کے چودھریوں میں بیٹھے یوں معلوم ہوتے کہ گویا وہ بھی ان میں کے ایک چودھری ہیں۔ چونکہ دیہات کی زندگی کے ہر شعبے کو جانتے تھے۔ اس لئے وہ آسانی سے دیہات والوں سے گھُل مل جاتے۔ اور سب ان کو اپنا سمجھنے لگتے، اور ان کی ہر بات کو ماننے کے لئے تیار ہو جاتے۔

اکبر صاحب پورے پانچ برس تک مدرسہ ابتدائی کے نگراں رہے۔ اس زمانہ میں مدرسہ ابتدائی کی شہرت ہندوستان کے ہر کونہ میں پھیل گئی۔ چنانچہ ہر نئے سال کے شروع میں داخل ہونے والے طلبہ کی اتنی درخواستیں آتیں۔ کہ اُن میں سے اکثر کو مسترد کرنا پڑتا۔ اکبر صاحب کو یہ مدرسہ اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں سب

لوگ گھروں کو چلے جاتے لیکن اکبر صاحب بدستور جامعہ نگر میں مقیم رہتے۔ اور فرصت کے
ان اوقات کو وہ جس طرح صرف کرتے تھے اس سے پتہ چلتا ہے کہ مرحوم کو یہ مدرسہ
کس قدر عزیز تھا۔ صبح ضروریات سے فارغ ہو کر ناشتہ کرتے۔ اور پھر فقیرا مالی کو پھاوڑہ
کے لئے پکار پڑتی۔ فقیرا اپنے ساتھی مالیوں کو لے کر آجاتا۔ اِدھر اکبر صاحب نیکر پہن کر
نکل آتے اور کھُدائی کا کام شروع ہو جاتا۔ اکبر صاحب کو یہ فکر ہوتی تھی کہ برسات سے
پہلے پہلے باڑ کے لئے نالیاں کھُد جائیں تاکہ اگست میں مدرسہ کھلے تو نئی باڑیں مدرسہ
کی زینت کے لئے اُگ کر تیار رہوں۔ اُنھیں اس کام میں اتنی جلدی ہوتی تھی کہ اگر
اتفاق سے ان کا کوئی دوست آجاتا تو وہ اُس کے ہاتھ میں بھی ایک پھاوڑا دے دیتے۔
اور جب تک دھوپ کافی تیز نہ ہو جاتی، بڑے انہماک سے اس کام میں لگے رہتے۔

اکبر صاحب بڑی دلجمعی اور خوش اسلوبی سے مدرسہ ابتدائی کے کام کو چلا رہے
تھے کہ ریاست رامپور کی طرف سے شیخ الجامعہ سے درخواست کی گئی کہ وہ جامعہ میں سے
کسی ایسے صاحب کو مستعار دیں جو ریاست کی تعلیم کو اپنے ہاتھ میں لے سکے۔ یہ کام
غیر معمولی اہمیت رکھتا تھا۔ ریاست میں کئی پرائمری اسکول تھے۔ بہت سے مڈل اسکول
بھی تھے۔ دو تین ہائی اسکول تھے اور ایک انٹرمیڈیٹ کالج تھا۔ اکبر صاحب شعبۂ تعلیم
کے سیکرٹری مقرر ہوئے اور تعلیم کے متعلق تمام کاموں کی نگرانی آپ کے سپرد ہوئی۔ اکبر
صاحب نے یہ کام جس عمدگی سے کیا اُس کی تفصیلات میں جانے کا یہ موقعہ نہیں۔ بدقسمتی
سے مرحوم کو موت نے اتنی مہلت نہ دی کہ جو کچھ وہ کرنے کا عزم رکھتے تھے اس کو تمام
کر پاتے۔ لیکن اس قلیل مدت میں بھی ہر شخص آپ کے حُسن اخلاق کا گرویدہ ہو گیا
تھا۔ مرحوم کے ساتھی تو اُن کی خوبیوں کے معترف تھے ہی۔ چنانچہ کوئی دن ایسا نہ جاتا

تھا کہ آپس کی ملاقاتوں میں ناغہ ہو جائے۔ ان کے علاوہ مرحوم کے بارے بھی دل سے ان کی عزت کرتے اور ان کو اپنا ایک عزیز سمجھتے۔ اور ان کی رائے اور کہنے پر پورا بھروسہ کرتے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ جن لوگوں کے دلوں میں مرحوم نے گھر کیا تھا وہ اُن کے ساتھ کام کرنے والے کالج اور اسکولوں کے اساتذہ تھے۔ اکبر صاحب خود اُستاد رہ چکے تھے اور وہ ہمیشہ بڑی سے بڑی مجلس میں نہایت فخر سے یہ کہا کرتے کہ میں جامعہ کے پرائمری مدرسہ کا اُستاد ہوں۔ اس لئے وہ اپنے ماتحت اُستادوں سے بڑی محبت اور دل سوزی سے پیش آتے، اور اُن کی سنتے اور نہایت عمدہ طریقہ سے اُن سے اپنی کہتے ریاست رام پور کے چھوٹے سے چھوٹے اور دُور اُفتادہ مدرسے کے کسی اُستاد سے پوچھیئے وہ سیکرٹری صاحب کا مداح نظر آئے گا۔ ممکن ہے ایک بار ہی اس مدرس کو سیکرٹری صاحب سے ملنے کا اتفاق ہُوا ہو لیکن ایک ملاقات میں جس خوش دلی، بے تکلفی اور مسکراہٹ سے انہوں نے بات کی ہوگی اس کا اثر مدرس پر اس قدر اچھا پڑا ہوگا کہ وہ اُنہیں اپنا ہمدرد دوست سمجھنے لگ گیا ہوگا۔ اور ساری عمر ان کو دعائیں دیتا رہے گا۔

اکبر صاحب رام پور میں تھے صحت ماشاء اللہ بہت اچھی تھی۔ انہی دنوں چیف منسٹر صاحب نے اُنہیں دہلی بھیجا کہ ریاست کی ایک سرکاری عمارت کی تعمیر کے سلسلہ میں ایک مشہور (ARCHITECT) سے مشورہ کریں۔ اس سے مل کر وہ باہر نکلے تو اِدھر اُدھر کہیں ٹیکسی نظر نہ آئی۔ آپ نے ایک تانگہ لیا۔ اور کناٹ پلیس (نئی دہلی) سے چل دئے۔ تھوڑی دُور گئے تھے کہ کوچبان نے گھوڑے کو مارنے کے لئے چابک بڑے زور سے گھمایا۔ مرحوم تانگہ کی اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ چابک بجائے گھوڑے کے لگنے کے آپ کے ماتھے پر لگا اور آپ تقریباً بیہوش سے ہو گئے۔ کوچبان نے پوری قوت سے

چابک کو حرکت دی تھی چنانچہ چابک کے لگتے ہی مرحوم کی آنکھ اور ملنے کو چھیلتے نکل گئے اس وقت مرحوم کو بڑی مشکل سے سنبھالا گیا۔ اس چوٹ کے بعد چند دنوں تک آنکھ میں سخت درد رہا۔ لیکن سینکنے سے افاقہ ہو گیا۔ اور چابک کی چوٹ کا اُن کو خیال نہ رہا۔ دو تین ماہ بعد یک لخت اُن کے ماتھے میں درد اُٹھا اور اُنہوں نے محسوس کیا کہ آنکھوں کی بینائی بھی کم ہو رہی ہے۔ وہ اُسے معمولی آشوب چشم سمجھے اور آنکھوں کا معائنہ کروا کے عینک لے لی۔ لیکن گاہے ماہے ماتھے میں برابر درد کی ٹیسیں اُٹھتی رہیں اور بصارت اتنی کم ہو گئی کہ قریب کی چیز بھی مشکل ہی سے نظر آتی۔ پہلے رام پور علاج ہوا۔ پھر مرحوم دہلی آئے۔ دہلی سے مدراس گئے۔ آخر ایکس ریز (EXRAY) سے یہ پتہ چلا کہ دماغ میں ٹیومر پھوڑا ہے۔ اس سلسلے میں سارے جتن کئے گئے۔ اور ہر طریقہ علاج آزمایا گیا۔ مرحوم مسلسل ایک برس تک بڑے صبر و رضا سے درد کی ناقابل برداشت تکلیف کو جھیلتے رہے نظر بالکل جا چکی تھی۔ جب درد کا دورہ پڑتا تھا تو جب تک برداشت کی سکت رہتی برداشت کرتے رہتے اور آخر جب یارائے ضبط نہ رہتا تو بے ہوش ہو جاتے جس طرح زندہ دلی۔ خوش مزاجی قہقہوں اور ہنسی خوشی میں انہوں نے زندگی کے دن گزارے تھے۔ اسی طرح جب اس موذی اور جان لیوا اذیت کی مرحوم پر اُفتاد پڑی تو اس کرب اور مصیبت میں بھی ان کی طبعی زندہ دلی نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا اور وہ بڑی ہمت اور دلاوری سے ہر دُکھ کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔

بیماری کے آخری دنوں میں مرحوم کی بصارت بالکل جا چکی تھی۔ تنو مند جسم مضمحل ہو گیا تھا۔ درد کی ٹیسیں بھی برابر اُٹھتی رہتی تھیں لیکن جب کبھی ذرا سا سکون ہوتا اور کوئی دوست تیمارداری کو آ نکلتا تو پھر لطیف گفتگو شروع ہو جاتی۔ بیماری کے

زمانے میں جن جن مصیبتوں سے سابقہ پڑ رہا تھا۔ مرحوم نے نہایت مؤثر اور دلکش اشعار میں اُن کا نقشہ کھینچا تھا۔ باتیں کرتے تو یوں معلوم ہوتا کہ کوئی تکلیف ہی نہیں۔ گھنٹوں اپنے حافظہ سے علم و حکمت کے انمول موتی جو برسوں کے مطالعہ سے فراہم کئے ہوئے تھے سناتے۔ بیماری کے اس تمام زمانے میں جس کی تکلیفوں کی دیکھنے والے بھی تاب نہ لا سکتے تھے۔ مرحوم نے کبھی اپنی زبان سے ایک کلمہ شکایت بھی نہیں نکالا۔ آپ اکثر فرماتے کہ مجھے قدرت سے کسی بات کا کوئی شکوہ نہیں اس نے مجھے بہت کچھ دیا اور بہت زیادہ فراخی سے دیا۔ والدین کی محبت دی، دوستوں کا اعتماد دیا، علم کی نعمت عطا فرمائی۔ جب تک تندرست رہا بھرپور صحت دی۔ اس نے دیا اور وافر دیا۔ اب مجھے اس سے کوئی شکوہ نہیں۔ میں اُس کی رضا پر راضی ہوں۔ بیماری کے ان ہولناک ایام میں جو کچھ وہ فرمایا کرتے تھے۔ اگر کبھی فرصت ملی، تو اس کے لکھنے کی کوشش کی جائے گی۔ بے شک وہ اس دُنیا سے رضائے الٰہی پر راضی گئے۔ اور ہم مجبوروں کی کیا مجال کہ اُس کی رضا میں دخل انداز ہوں لیکن اکبر حبیب صاحب کی تو ایسا حادثہ نہیں کہ اُنکے جاننے والے اسے بھول جائیں اگر آج ہم میں نہیں لیکن اُنکی یادیں دلوں سے کبھی محو نہ ہوں گی۔

وہ ہمیشہ یاد رہنے والی خوبیوں کے مالک تھے اُن کے مرنے سے وہ خوبیاں مر نہیں سکتیں۔ جامعہ کی برادری اور ان کے رام پور کے ساتھی مرحوم کو کبھی بھلا نہیں سکیں گے۔

عربی زبان کی مشہور شاعرہ خنسا جو ساری عمر اپنے جواں مرگ بھائی صخر کا نوحہ کرتی رہی، مرحوم بھائی کے متعلق ایک شعر میں کہتی ہے: "آفتاب مشرق سے طلوع ہوتا ہے تو وہ مجھے صخر کی یاد دلاتا ہے کیوں کہ وہ صبح میدانِ کارزار میں شجاعت کے جوہر دکھلانے کا عادی تھا اور جب سورج

مغرب میں ڈوبتا ہے تو مجھے صغریٰ یاد آتی ہے۔ شام کو وہ مہمان نوازی کے فرائض ادا کرتا تھا۔ خدا کو تو صرف صبح اور شام کو صغریٰ یاد آتا تھا۔ لیکن اکبر کے دوست، اس کے بھائی، اور اس کے ساتھی جب تک وہ زندہ ہیں ہر محفل میں اور ہر دلچسپی کے موقع پر اس کو یاد کرتے رہیں گے کیونکہ شعر و نغمہ کی کوئی مجلس ہوتی تھی تو اکبر اپنے دل سوز نغمہ اور پرکیف اشعار سے سب کو محظوظ کرتا تھا۔ علم و حکمت کا موضوع ہوتا تو اکبر اس میں اپنے کمالات علمی دکھاتا۔ اور جسمانی مجلس اور کسرت کی سرگرمیوں میں شریک ہوتا، تو سب سے اپنے جوہر کا خراج تحسین حاصل کرتا وہ ہر محفل کی جان تھا احباب کی صحبتیں اس کے دم سے زندہ تھیں وہ مر گیا، زندہ دلی، علم، حقیقت رس نگاہ اور ایک لفظ میں زندگی ہمارے ہاں سے رخصت ہو گئی۔

مولانا عبید اللہ سندھی

۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء کو پنجاب کے ضلع سیالکوٹ میں ایک سکھ گھرانے میں ایک لڑکا پیدا ہُوا۔ لڑکے کی پیدائش سے پہلے ہی باپ کا انتقال ہو چکا تھا بیوہ ماں نے خدا کا بہت بہت شکر ادا کیا کہ بیوگی کا سہارا مل گیا۔ بہنوں کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی کہ خُدا نے انہیں بھائی دیا۔ ماموں نے اطمینان کا سانس لیا کہ جوان بہن کا اُجڑا ہُوا گھر پھر آباد ہو گیا، یہ بچّہ گھر بھر کا لاڈلا تھا۔ ماں نے بڑے نازوں سے اسے پالا، بہنیں تھیں کہ ننھے بھائی پر قربان ہو ہو جاتی تھیں، اس محبت بھری فضا میں اس بچے نے آنکھیں کھولیں۔ ماموں جام پور ضلع ڈیرہ غازی خان میں پٹواری تھے بچّے نے کچھ ہوش سنبھالا تو ماموں نے وہیں کسی سکول میں داخل کرا دیا۔

ضلع ڈیرہ غازی خاں یوں تو پنجاب کے صوبہ میں ہے لیکن اس کی حدیں سندھ اور صوبہ سرحد سے ملی ہوئیں ہیں۔ آبادی بیشتر مسلمانوں کی ہے اس علاقہ میں پیر ول اور

فقیروں کی بڑی قدر ہے اور عوام وخواص دونوں کو تصوّف سے بڑا لگاؤ ہے صدیوں سے اس
سرزمین میں بڑے بڑے صوفیا اور اہل اللہ پیدا ہوتے رہے اور اُن کی باتیں اور یادگاریں
ہر طرف سننے اور دیکھنے میں آتی ہیں یہ ماحول تھا جس میں اس لڑکے کے دن اور سال گزرے
دوسری طرف گھر کے بڑے چھوٹے سب سکھ تھے سکھ مذہب کی ابتدا بابا گورو نانک سے
ہوئی ہے بابا جی خود درویش تھے اور ان کی تعلیمات مسلمان صوفیوں سے بہت ملتی جلتی
ہیں۔ بعد میں سکھ مذہب نے جو شکل اختیار کی، وہ بالکل دوسری ہے، اور زیادہ تر وہ نتیجہ ہے
اُس زمانے کے سیاسی حالات کا۔ بہرحال سکھ گھرانوں کو اسلام اور تصوّف کے اصل
اصولوں سے زیادہ بُعد نہیں۔ مذہب کی نمائشی رسوم سے بیزاری، خدا کو ایک ماننا، سب
مخلوق کو برابر جاننا۔ اچھے کاموں ہی کو اصل نیکی سمجھنا یہ بنیادی باتیں ہیں گورو نانک کی تعلیم
کی۔ ظاہر ہے اس سکھ لڑکے کا اپنے اردگرد کے مسلمانوں سے ملنے جلنے میں پرہیز نہ کرنا کوئی
تعجب کی بات نہ تھی۔ آخر اس کا مسلمانوں سے میل جول بڑھا اور دوسرے مذہب والوں سے
عموماً جو کدورت ہوتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ دُور ہو گئی۔ اور اس لڑکے کو مسلمانوں کی
زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔

اس لڑکے نے محسوس کیا کہ جن چیزوں کو میں دل سے ٹھیک سمجھتا ہوں اور میری عقل
اُن پر پورا یقین رکھتی ہے، وہ چیزیں ہندوؤں اور سکھوں کے مذہبی طور طریقوں سے زیادہ
اسلام میں ہیں۔ یہ اُس کا اپنا مشاہدہ تھا کسی مولوی نے اُسے دلیل سے قائل نہ کیا تھا اور نہ
کسی بزرگ کی سنی سُنائی بات پر اُس نے یقین کر لیا تھا۔ اس لڑکے نے دیکھا کہ سکھ بھی خدا کو
ایک مانتے ہیں اور مسلمان بھی خدا کو ایک ہی مانتے ہیں لیکن اسلام کا ایک خدا کا تصور سکھوں
سے بلند تر ہے مساواتِ انسانی دونوں مذہبوں میں موجود ہے لیکن اسلام نے مساوات کو

جس طرح عملی شکل دی ہے وہ سکھوں سے ارفع ہے۔ مذہب کی نمائشی رسوم سے دونوں مذہبوں کو نفرت ہے لیکن سکھ مذہب نے تو اپنے آپ کو ان رسوم میں بُری طرح مقید کر لیا ہے۔

اس چھوٹے سے لڑکے کے دل میں یہ خیالات اُٹھتے رہے، وہ سوچتا اور غور کرتا۔ اور معلوم نہیں کتنی راتیں اس نے اس سوچ میں جاگ جاگ کر کاٹیں اور ہفتوں نہیں مہینوں وہ اسی ادھیڑ بُن میں رہا۔ کہ وہ مذہب جس کو اس کی ماں، بہنیں، ماموں دل سے سچا مانتے ہیں اور اس کی سیوا اُن کو سب سے زیادہ عزیز ہے، وہ سچا نہیں بلکہ اسلام جو غیروں کا مذہب ہے، یہ غیر نہ اس کے رشتہ دار ہیں اُس کی اور اُن کی کوئی بات ایک سی نہیں۔ ان میں سے کسی نے اس کی پرورش نہیں کی کسی نے ماں اور بہن کی طرح جان اور دل اس پر نچھاور نہیں کیا لیکن ان غیروں کا مذہب سچا ہے۔ اس کی حقانیت خود بخود دل میں اتر تی جاتی ہے اُن کے طور طریقوں کو دل مانتا ہے اور عقل قبول کرتی ہے اب وہ کرے تو کیا کرے۔ ایک طرف وہ ہے جس کے جگر کا وہ ٹکڑا ہے ماں نے معلوم نہیں کن کن اُمیدوں کے ساتھ خون پلا پلا کر اُسے پروان چڑھایا ہے۔ بہنیں ہیں جو اُسے "دیر۔ دیر" کہتی تھکتی نہیں۔ اب اگر وہ اپنے دل اور دماغ کا کہنا مانتا ہے تو ماں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ بہنوں کو چھوڑنا پڑتا ہے، ماموں سے الگ ہونا پڑتا ہے۔ سارے خاندان سے جُدائی ہوتی ہے آخر ہو کیا۔ وہ برابر سوچتا رہا۔ کوئی حل ایسا نظر نہ آتا تھا کہ دل کی بات بھی مان لے اور اپنوں سے قطع تعلق بھی نہ ہو۔ وہ مہینوں اس چکر میں سرگرداں رہا آخر اُسے فیصلہ کرنا ہی پڑا۔

ایک دن چپ چپاتے یہ لڑکا گھر سے نکل گیا۔ نہ ماں کو اطلاع دی اور نہ ماموں کو خبر ہوئی۔ چلتے چلتے یہ بہت دُور نکل گیا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں تعاقب نہ ہو راتے میں

اُسے ماں کی ماںتا یاد آتی تھی۔ بہنوں کی محبت بھی پیچھے کی طرف کھینچتی تھی لیکن یہ لڑکا برابر آگے بڑھتا گیا۔ اُس کے جی میں جو بات سمائی تھی وہ کسی محبت اور کسی قیمت پر لے چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ آخر چلتے چلتے وہ صوبہ سندھ میں داخل ہو گیا اور وہاں ایک خداشناس بزرگ کے دستِ مبارک پر اس نے اسلام قبول کر لیا۔ یا دوسرے لفظوں میں اس لڑکے نے اپنی بات خود اپنے آپ سے منوالی۔ یہ جد و جہد بہت کٹھن تھی۔ لیکن یہ عزم بڑی ہمت والے کا عزم تھا۔ اپنی بات سے پھر جانا اس کے نزدیک زندگی سے منہ موڑنا تھا۔ آخر زندگی ہے کیا؟ رشتہ داروں کی محبت، گھر کا آرام یا ایک عقیدہ، اور اس کے لئے جد و جہد۔ اس طرح اس لڑکے نے سب کچھ کھو کر اپنے آپ کو پا لیا۔ اپنی بات خود اپنے آپ سے منوا کر چھوڑی۔ پرانا نام چھوڑا اور عبید اللہ کہلایا۔

کہنے کو تو یہ کہا جائے گا کہ ایک سکھ لڑکے نے اپنا مذہب بدل دیا اور وہ سکھ سے مسلمان ہو گیا۔ کہنے کے لئے یہ بات ہے تو ٹھیک۔ لیکن کیا ہم اسے یوں نہیں کہہ سکتے کہ اس لڑکے کو قدرت کی طرف سے ایسی طبیعت عطا ہوئی تھی جو تمام مذہب کی اصل غایت یعنی خداشناسی تک پہنچنے کے لئے بیتاب رہتی تھی۔ سکھ سماج اس بیتاب طبیعت کی تسلی نہ کر سکا۔ اس لڑکے نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور مسلمانوں کی سوسائٹی میں اپنے لئے خداشناسی کی راہ ڈھونڈھی یعنی اس کی رُوح پر سکھ سماج کا لباس تنگ تھا۔ وہ لباس اُس نے اُتار پھینکا۔ اور اسلام کا لباس جو اُس کی نظر میں کشادہ اور وسیع تھا پہن لیا۔ اب یہ سکھ لڑکا مولوی عبید اللہ تھا ہے اور سندھ میں اپنے پیر و مرشد سے تصوّف اور طریقت کی ابتدائی منزلیں طے کرتا ہے۔ اس کی طبیعت کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اور جس چیز کے لئے اُس نے ماں، بہن اور عزیز چھوڑے تھے وہ اُسے مل جاتی ہے۔

پچیس برس کی عمر میں سندھ سے مولوی عبیداللہ دینی تعلیم کی خاطر دیوبند آتے ہیں۔ یہاں انہیں مولانا محمود الحسن جیسا اُستاد ملتا ہے جو شاگرد کی رہنمائی اس اسلوب سے کرتا ہے کہ شاگرد کی ذات اپنی تکمیل کی راہ میں کسی قسم کی روک محسوس نہیں کرتی۔ اُستاد کامل تھا، شاگرد کو اپنے ساتھ کمال کی منزل پر لے جا سکا۔ ورنہ بعید نہ تھا کہ جو شخص دلی تسکین نہ پاکر اپنے ماں اور عزیز رشتہ داروں سے منہ موڑ سکتا ہے وہ اُستاد کی رہنمائی سے سرتابی نہ کرتا۔

مولوی عبیداللہ نے دیوبند میں تمام اسلامی علوم پر عبور حاصل کیا۔ عربی زبان پڑھی، تاکہ قرآن سمجھیں، تفسیر اور حدیث کا مطالعہ کیا۔ فقہ پڑھی، منطق اور فلسفہ میں درک پیدا کیا۔ مولوی عبیداللہ کی طبیعت جم گئی، اور اس تعلیم اور مطالعہ نے انہیں پکا مسلمان بنا دیا۔ انہیں اس امر کا یقین ہو گیا کہ خدا تک پہنچنے کا یہ راستہ سب سے سیدھا اور یقینی ہے۔

دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر مولانا عبیداللہ سندھ لوٹے اور چھ سات برس تک جو کچھ پڑھا تھا طالب علموں کو پڑھاتے رہے۔ مولانا نے ایک مدرسہ بھی قائم کیا، طلبہ کو جمع کیا۔ ان کی کفالت اور مدرسین کے گذارے کا بار بھی خود اٹھایا۔ اور جس گوہر مقصود کو انہوں نے اتنی محنت اور مصیبت کے بعد حاصل کیا تھا، خاص و عام کو اس سے روشناس کرتے رہے۔ ایک مدت کے بعد مشفق اُستاد نے ہونہار شاگرد کو دیوبند بلوا بھیجا اور مدرسہ کے پرانے طلبہ کی تنظیم کا کام ان کے سپرد ہوا۔ مولانا عبیداللہ دیوبندی فرد تھے لیکن دیوبندیت کے ظاہری رنگ روپ اور شکل و صورت کے تو وہ کبھی قائل نہ تھے وہ تو دیوبندی روح کے ماننے والے تھے، جو شاہ ولی اللہ سے مشائخ دیوبند نے حاصل کی ہے اور مولانا محمد قاسم بانی مدرسہ اس کے مبلغ تھے۔ اور مولانا محمود الحسن نے ظواہر اور رسوم کے تمام پردے ہٹا کر اپنے عزیز شاگرد کو اسی روح کا جلوہ دکھایا تھا، جس سے مولانا عبیداللہ کو سکون ملا تھا۔

یہاں دیوبند میں مولینا کی مسلمانوں کے سماج سے ٹکر ہوئی اور جس طرح سکھ سماج کا دائرہ مولینا کے لئے تنگ ثابت ہوا، مسلمانوں کے خود ساختہ سماج نے جسے وہ اسلام کا نام دیتے تھے مولینا پر اپنے دروازے بند کر دیئے اور مشائخ دیوبند کے ایک حصّہ کی بارگاہ سے مولینا کو کافر کا لقب ملا۔ خوش قسمتی سے مولینا جان گئے تھے کہ اسلام وہ نہیں جس کے ٹھیکیدار یہ لوگ ہیں۔ ان کے کفر کے فتوے کے بعد مولینا کو اپنے مسلمان ہونے کا اور زیادہ یقین ہو گیا۔

دیوبند سے مولینا عبید اللہ دہلی آ گئے، اور پہلے کے بنے ہوئے اسلامی سماج کے خلاف قرآن کے بتائے ہوئے اصولوں پر اسلامی سماج بنانے کی طرح ڈالی۔ نظارۃ المعارف دہلی کے مدرسہ کی تاسیس کا مقصد یہی تھا۔ مولینا نے سمجھ لیا تھا کہ خدا شناسی کا سب سے اچھا طریقہ اسلام ہی ہے گو مسلمانوں نے اس کی حقیقت بگاڑ رکھی ہے لیکن اس طریقہ کا دستور اب تک اپنی اصلی شکل میں موجود ہے، یہ دستور قرآن کریم ہے۔ مولینا نے خدا کا نام لے کر اپنا کام شروع کر دیا۔ لیکن ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کی وجہ سے اور دوسری اہم ضرورتوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

اس وقت مسلمانوں کی ساری اُمیدیں ترکی خلافت سے وابستہ تھیں۔ اور انگریزوں نے ترکوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی تھی۔ ہندوستان کے مسلمان زعما اپنے ترک بھائیوں کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ مولینا عبید اللہ کو اپنے اُستاد کا حکم ملا۔ کہ وہ کابل روانہ ہو جائیں۔ سُنا ہے مولینا کابل جانے کے لئے آمادہ نہ تھے لیکن اُستاد کے حکم کی سرتابی بھی گوارا نہ تھی۔ بوڑھی سکھ ماں کو جس کی زندگی کا سہارا اُس کا صرف یہ مسلمان لڑکا تھا اللہ پر چھوڑا۔ اور ۱۹۱۵ء میں بڑی دقتوں سے آپ کابل پہنچ گئے۔

افغانستان پر اُس زمانے میں امیر حبیب اللہ خاں کی حکومت تھی۔ امیر موصوف

ایک حد تک دولتِ برطانیہ کے زیرِ اثر تھے۔ اور خاص طور پر سلطنت کے خارجی معاملات
میں وہ معاہدہ کی رُو سے پابند تھے کہ کوئی قدم برطانیہ کے صلاح مشورے کے بغیر نہ
اُٹھائیں، اُدھر ہندوستان سے مولانا عبید اللہ ایک واضح اور متعین مقصد کے پیش نظر
گئے تھے۔ اس زمانہ میں ہندوستان سے نکلے ہوئے بعض اور لوگ بھی کابل پہنچ گئے تھے
نیز عثمانی سلطنت اور جرمنی کی طرف سے بھی چند نمائندے امیر حبیب اللہ خاں کے
پاس آئے تھے، ان سب کی کوشش یہ تھی کہ پٹھان انگریزوں سے بھڑ جائیں۔ امیر
موصوف بظاہر ان سب سے اچھی طرح سے پیش آتے۔ لیکن انہوں نے برطانیہ سے
بگاڑنا مصلحت کے خلاف سمجھا۔ افغانی سیاست کا یہ دور بڑا پُرآشوب تھا۔ ایک
طرف کابل میں برطانی اور روسی مدبر اپنی تدبیروں میں لگے ہوئے تھے۔ اور ان کی کوشش
تھی کہ افغانستان غیر جانب دار رہے۔ دوسری طرف اُن کے دشمن امیر حبیب اللہ خاں
کو ہندوستان پر حملہ کرنے پر اُکسا رہے تھے۔

ان دنوں کابل ایشیا کا سوئٹزرلینڈ بنا ہوا تھا۔ اور یہاں ہر سلطنت کے مدبر
اور سیاست داں جوڑ توڑ کرنے میں مصروف تھے۔ مولانا نے بین الاقوامی سیاسیات کی اس
تمام کشمکش کو دیکھا اور صرف دیکھا نہیں، بلکہ اس میں بطور ایک اہم فرد کے شریک بھی
رہے۔ آپ نے کابل میں امیر حبیب اللہ کی حکومت کا بھی غور سے مطالعہ کیا اور استبدادی
سلطنتوں کو اندر ہی اندر جو گھن کھا رہا تھا وہ آپ کی آنکھوں نے صاف صاف دیکھ لیا۔
مولانا عالمگیر اخوتِ اسلامی کے جذبہ کے ماتحت وطن سے نکلے تھے اور اس وقت
ان کا اور ان کے ساتھیوں کا یہ خیال تھا کہ جان پر کھیل کر بھی خلافتِ عثمانیہ کو بچانے
کی کوشش کی جائے۔ مولانا نے یہاں آکر دیکھا کہ ہر ملک کی اپنی خاص ضرورتیں ہیں اور

وہاں کے لوگ مجبور ہیں کہ اپنی قومی ضرورتوں کو مقدم رکھیں اسی سلسلہ میں آپ کو اس بات کا بھی علم ہوا کہ ہر شخص کو اپنے وطن سے، اپنی زمین سے اور اپنی مخصوص روایات سے کتنی شیفتگی اور وابستگی ہوتی ہے اور افغان اور ہندوستانی مسلمان ہونے کے باوجود دونوں اپنا ایک قومی وجود رکھتے ہیں افغان کو یہ گوارا نہیں کہ ایک ہندوستانی کے ماتحت کام کرے۔ اسی طرح ہندوستانی کو بھی افغان کی سرداری کھلتی ہے ہمارے خیال میں یہ پہلی ٹکر تھی جو مولینا کے ما فوق قومی تصورکو لگی۔ اور آپ نے محسوس کیا کہ قوم کا وجود ایک مستقل حقیقت ہے۔ مولینا آج کل ہندوستانیت پر جو زیادہ زور دیتے ہیں اور بین الاقوامیت کی بنیاد مستقل قومی وحدتوں پر رکھنا چاہتے ہیں۔ اور ہندوستانی مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ جب تک تم ہندوستانی نہ بنوگے نہ تمہاری اپنے ملک میں عزت ہوگی اور نہ اسلامی ملکوں میں تمہیں احترام کی نظروں سے دیکھا جائیگا کابل کی زندگی کے یہ چند سال مولینا کے ان افکار کو سمجھنے میں بڑی مدد دے سکتے ہیں۔

مولینا کابل ہی میں تھے کہ جنگِ عظیم کا فیصلہ ہوگیا جرمنی نے ہار مان لی اور ترکی خلیفہ فتحمند اتحادیوں کا اسیر ہوگیا۔ مولینا ترکی کی خلافت کو بچانے وطن سے نکلے تھے۔ اب انہوں نے دیکھا کہ وہ خلافت تقریباً ختم ہوگئی ہے اور اخوت اسلامی کا برائے نام رہا سہا جو مرکز تھا۔ وہ بھی باقی نہیں رہا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست کا وہ دور جو بلقان اور طرابلس کے ہنگاموں سے شروع ہوا۔ اور جس کے پیش نظر ترکی خلافت کی مدد سے ہندوستان میں اپنے اسلامی وجود کو باوقار بنانا تھا انقلاب ترکی خلافت کی شکست کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے۔ ہندوستان میں اس کے بعد اسلامی سیاست کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ مولینا محمود حسن مالٹا کی اسیری کے بعد جب ہندوستان لوٹے تو کانگریس

میں شریک ہو گئے۔ اور ان کی جماعت کے دوسرے بزرگ مثلاً مولینا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، مولینا شوکت علی اور مولینا ابو الکلام آزاد وغیرہ نے بھی کانگریس میں شرکت کی۔ اسی زمانہ میں کابل میں بھی کانگریس کمیٹی کی ایک شاخ کھولی گئی اور مولینا عبید اللہ اس کے ... بنے۔

مولینا کا بیان ہے کہ دوران قیام کابل میں امیر حبیب اللہ خاں کے حکم پر ... پریس انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہوا اُس وقت کابل میں بعض انقلابی ہندو بھی موجود تھے۔ امیر صاحب چاہتے تھے کہ مسلمان ہندؤں کے ساتھ مل کر سیاسی کام کریں۔ بدقسمتی سے ہمارے اکثر مسلمان زعماء کو اب تک ہندوستان کی اسلامی سیاست کے اس نئے دَور کا صحیح اندازہ نہیں ہوا۔ وہ اب تک بین الاسلامیت کے خواب دیکھ رہے تھے۔ مولینا نے افغانستان میں رہتے ہوئے دیکھ لیا تھا کہ اب مصلحت کا تقاضہ کیا ہے۔ اور مسلمانوں کی سیاست کا رُخ کیا ہونا چاہیئے۔

اسی زمانہ میں افغانستان میں بھی ایک انقلاب رونما ہوا۔ امیر حبیب اللہ خاں اپنے سرمائی پایہ تخت جلال آباد میں کسی نامعلوم قاتل کی گولی کا نشانہ بنے۔ اُن کے بعد اُن کا بھائی نصر اللہ خاں تخت کا وارث بن کر اُٹھا۔ لیکن تقدیر نے مرحوم کے ایک منجھلے صاحبزادہ کی سازگاری کی۔ اور وہ امیر افغانستان بن گیا۔ امیر امان اللہ خاں نے برسرِ اقتدار آتے ہی ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ ایک مختصر سی لڑائی کے بعد دونو حکومتوں میں صلح ہو گئی۔ اور امیر امان اللہ خاں ہز میجسٹی امان اللہ خاں بن گئے اور افغانستان امارت سے دولت مستقلہ کے بلند مقام پر پہنچ گیا۔ اور خارجی اور داخلی ہر لحاظ سے ہندوستان کی یہ ہمسایہ سلطنت آزاد ہو گئی۔

امیر حبیب اللہ خاں کے زمانۂ حکومت کے بعد مولینا نے اعلیٰحضرت امان اللہ خاں کا دَور بھی دیکھا۔ معلوم نہیں کیا وجوہ تھے کہ مولینا نے ۱۹۲۲ء میں افغانستان چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ کابل سے مولینا روس تشریف لے گئے۔ اور کم و بیش ایک سال آپ کا روس کے سفر اور ماسکو کے قیام میں گذرا۔ ماسکو سے ۱۹۲۳ء میں آپ ترکی چلے آئے۔

مولینا روس میں ایک کانگرس کے رکن کی حیثیت سے گئے۔ اس وقت لینن ابھی زندہ تھا۔ زار کا روس ختم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ نیا اشتراکی روس بن رہا تھا۔ مولینا نے روس میں اشتراکی انقلاب کے کارکنوں کو سرگرم عمل دیکھا۔ ان کے ولولے، ہمتیں، قربانیاں، جفاکشیاں اور عزت، دولت اور منصب پانے کے خیال سے نہیں بلکہ ایک اعلیٰ مقصد کے لئے خوشی خوشی جانیں دینا ایسی باتیں نہ تھیں کہ مولینا دیکھتے اور متاثر نہ ہوتے۔ ماسکو میں مولینا کا قیام تقریباً ایک برس تک رہا۔ افغانستان کے دوران قیام میں آپ نے علماء کی تنگ خیالی اور اسلامی حکومت کی گراوٹ کے بہت سے مناظر دیکھے تھے۔ اور انہیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ علم و مذہب اور دولت و حشمت کے یہ سب بےجان لاشے ہیں۔ اس کے بعد مولینا روس آئے تو انہوں نے بالکل نئی بنیادوں پر ایک نئے عالم کو تعمیر ہوتے دیکھا۔ آپ ان معماروں کی اولوالعزمی اور بلند خیالی سے متاثر بھی ہوئے، لیکن اس کے باوجود آپ کی اسلام کے ساتھ شیفتگی کم نہ ہوئی۔ نیا روس بالکل لادینی تھا، اور مولینا پکے دیندار۔ لیکن مولینا کی دینداری نے انقلابیوں کی اس لادینی میں بھی صحیح دینی جذبہ کو سرگرم عمل پایا۔ مولینا ماسکو میں بہت سے اشتراکی لیڈروں سے ملے آپ کو اشتراکیت کے مبادی اصول کے مطالعہ کا بھی موقعہ ملا۔ آپ نے

کھلے دل سے روسی انقلاب کی ہر اچھی چیز کو سراہا، اور انقلاب برپا کرنے والوں کی معجزانہ قوتوں کو تسلیم کیا، لیکن اس کے باوجود آپ مسلمان ہی رہے۔ اور اسلام روسی انقلاب کی ان ساری پابندیوں سے بھی انہیں بلند تر نظر آیا۔

مولینا کی طبیعت ایسی ہے کہ جس بات کو وہ دل سے مان لیں کوئی امر اس کے اظہار میں مانع نہیں ہو سکتا۔ کوئی روک جو ان کے آگے قدم بڑھانے میں حائل ہو، مولینا اس روک کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ روک کسی نام سے ہو مذہب کے نام سے ہو کسی بزرگ کے نام سے ہو۔ مولینا کی طبیعت اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر ان کو اسلام کا انقلاب روس کے انقلاب سے کم تر نظر آتا تو وہ بے جھٹکے اشتراکیت کو قبول کر لیتے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ مولینا ایسی انقلابی طبیعت اور ماسکو کا انقلابی ماحول، پھر بھی مولینا اسلام سے روگرداں نہ ہو سکے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ یہ اسلام جو انہیں روس کے انقلاب سے بھی بلند تر نظر آیا تھا وہ اسلام نہ تھا جس کے عملی نمونے آپ نے ہندوستان اور افغانستان میں دیکھے تھے چنانچہ اب ان کے دل و دماغ میں نام نہاد "اسلامی سماج" اور مستبد مسلمان بادشاہوں کی "اسلامی حکومتوں" کے لئے مطلق کوئی جگہ نہ رہی تھی۔ انہیں ان کے متعلق شک پہلے ہی تھا لیکن ان کے باطل ہونے کا یقین انہیں روس کے سفر میں حاصل ہوا۔

ماسکو سے مولینا ترکی آئے۔ اس وقت مصطفےٰ کمال ترکی کو کمالی ترکی بنا رہے تھے۔ خلافت منسوخ کی جا چکی تھی۔ شرعی قانون کی جگہ سوئٹزرلینڈ کے قانون نے لے لی تھی۔ ترکی ٹوپی ممنوع قرار دی جا چکی تھی۔ شیخ الاسلام کو ترکی سے رخصت کر دیا گیا تھا۔ اوقاف ضبط اور مذہبی مدرسے حکماً بند کر دیئے گئے تھے۔ ترکی زبان عربی حروف

کے بجائے لاطینی حروف میں زبردستی لکھوائی جاتی تھی۔ الغرض پرانی زندگی کا ہر رنگ مٹایا جا رہا تھا۔ ایک نئی ترکی بن رہی تھی اور ترک نیا جنم لے رہے تھے۔

مولینا ساڑھے تین سال تک ان سب انقلابات کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا دیکھتے رہے۔ ان کے دل پر جو کچھ گذری ہم نہیں جانتے۔ لیکن مولینا عبیداللہ ایسی طبیعت والے انسان پر اس قسم کے شدید حادثات کا جو اثر ہو سکتا ہے۔ اس کا اندازہ کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ مولینا اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں کہ اپنی پسند کی چیز نہ دیکھیں تو آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اپنے دل کو یہ ڈھارس دے لیتے ہیں کہ اگر ہم اس چیز کو نہیں دیکھ رہے ہیں تو وہ چیز سرے سے موجود ہی نہیں۔ مولینا اپنی آنکھیں ہمیشہ کھلی رکھتے ہیں۔ اور اپنے دل و دماغ پر کسی قسم کی مُہر لگانے کے روادار نہیں۔ چنانچہ مولینا نے رُوسی انقلاب اور ترکی انقلاب کو خوب دیکھا اور ان دونوں انقلابات کے تجربات کو دل میں لئے اسلام کے اصلی مرکز میں پہنچے۔

ترکی سے مولینا نے سرزمین حجاز کا رُخ کیا۔ حجاز آتے آتے اٹلی اور سوئٹزرلینڈ کی سیاحت بھی ہو جاتی ہے۔ حجاز آئے تو ابن سعود کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ دس بارہ سال تک مولینا حجاز میں مقیم رہے۔ اور ابن سعود کی "خالص اسلامی حکومت" کا نہایت قریب سے مطالعہ کرتے رہے۔

مولینا فرماتے ہیں کہ میں نے حجاز پہنچ کر وہاں کی حکومت سے ایک کانگریس کے رکن کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا۔ اس سے یہ ہوا کہ حجاز کے معاملہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے اس وقت جو دو گروہ بن گئے تھے۔ میں اس سے بے تعلق اور غیر جانبدار تسلیم کر لیا گیا۔ اور مجھے ارض مقدسہ میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ مولینا کا یہ سارا زمانہ

درس و تدریس میں صرف ہُوا۔ آپ کو بعض ہندوستانی اور عرب احباب سے کتابیں مل جاتیں۔ آپ یا تو مطالعہ کرتے یا جاوی اور ہندوستانی طلباء کو پڑھایا کرتے۔ ان دس بارہ برسوں میں آپ نے شاہ ولی اللہ کی تصنیفات کو بالاستیعاب بار بار پڑھا۔ اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کی تیرہ سو سال کی تاریخ پر تنقیدی نظر ڈالی۔

حجاز کے زمانۂ قیام میں آپ سیاسی سرگرمیوں سے بالکل دُور رہے۔ اور آپ نے سارا وقت مطالعہ و تدریس میں گذارا۔ جب کبھی کسی کو مولینا کے مکان پر جانے کا اتفاق ہوتا تو آپ کا کمرہ کتابوں سے بھرا ہوا پاتا۔ ایک طرف مصر کی تازہ بتازہ اور نوبنو عربی تصنیفات نظر آتیں۔ اور دوسری طرف اردو کی نئی مطبوعات اور تازہ رسالے پڑے ہوتے اور شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادوں کی کتابیں تو سب سے نمایاں جگہ پر ہوتیں۔

حجاز میں مولینا نے دس بارہ سال کا طویل زمانہ گزارا۔ اور اس عزلت میں وہ اپنی گذشتہ زندگی اور اس کے تجربات کا برابر جائزہ لیتے رہے اس زمانہ میں اُنہوں نے اپنے افکار بھی مرتب کئے۔ اور چونکہ ان افکار کی افادیت اور صداقت کو وہ عملی دُنیا میں کامیاب ہوتا دیکھ چکے تھے۔ اس لئے ان کے سچے ہونے پر ان کو غیر متزلزل یقین تھا۔ مولینا چاہتے تھے کہ اپنی اس بصیرت کو عام کریں۔ اور ان طول طویل تجربوں کے بعد جو کچھ اُنہوں نے سیکھا ہے اُسے دوسروں کو بھی سکھائیں۔ لیکن حجاز والے نہ ان کی باتیں سمجھ سکتے تھے اور نہ اُنہیں ان کی ضرورت تھی۔ ان افکار و خیالات سے صرف مولینا کے اہلِ وطن ہی فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔ اس لئے جب اُنہیں واپس وطن آنے

کا موقعہ ملا۔ تو اُنھوں نے حکومت کی وُہ تمام قیود و شرائط مان لیں۔ جن کو مانے بغیر ان کا ہندوستان آنا مشکل تھا۔ مولینا زندگی کے آخری دنوں میں صرف اسی غرض سے وطن آئے ہیں کہ اپنے اہل وطن کے سامنے اپنے چوبیس برس کے تجربات کا حاصل پیش کریں۔

۷۔ مارچ ۱۹۳۹ء کو مولینا کراچی کے ساحل پر اُترے اور آپ نے اُترتے ہی اپنے خیالات کی اشاعت شروع کردی۔ مولینا نئے عزم و استقلال کے ساتھ اپنے وطن لوٹے ہیں۔ چوبیس برس کا جلاوطنی کا زمانہ جو بقول ان کے پیہم خطرات کا سامنا کرتے گزرا۔ اور اس طویل مدت میں شاید ہی ان کی ایک رات کبھی اطمینان سے کٹی ہو۔ مولینا بیتاب ہیں کہ اس طویل عرصہ میں جو جو باتیں اُبھر اُبھر کر ان کے دل کے اندر ہی اندر ڈبی رہیں، انہیں بے محابا کھلے بندوں سب کو سنائیں۔ مولینا کی یہ باتیں بعض لوگوں کو بڑی تلخ لگتی ہیں۔ لیکن وہ جانتے نہیں کہ مولینا نے جو حقائق دیکھے ہیں، وہ کتنے تلخ ہیں۔ اور ان تلخ حقائق کا جاننا ہندوستان والوں کے لئے کتنا ضروری ہے۔

مولینا کہتے ہیں کہ یہ گھروندے جو تم نے بنا رکھے ہیں۔ اور اُنہیں تم فلک الافلاک سے بلند سمجھتے ہو یہ گھروندے زمانہ کے ہاتھ سے اب بچ نہیں سکتے۔ تمہارا تمدن، تمہارا سماج، تمہارے افکار، تمہاری سیاست اور تمہاری معاشرت سب کھوکھلی ہو چکی ہے۔ تم اسے اسلامی تمدن کہتے ہو لیکن اس تمدن میں اسلام کا کہیں شائبہ بھی نہیں۔ تم مذہب کا نام لیتے ہو لیکن یہ مذہب محض تمہاری ہٹ دھرمی کا نام ہے۔ مسلمان بنتے ہو تو اسلام کو سمجھو۔ یہ اسلام جسے تم اسلام کہتے ہو یہ تو کفر سے بھی بدتر ہے۔ تمہارے امیر جاہ پرست ہیں۔ حکمراں شہوات میں پڑے ہیں۔ اور غریب طبقے توہمات کا شکار ہو رہے ہیں۔ بدلو۔ ورنہ زمانہ تمہارا نشان تک بھی نہ چھوڑے گا۔ سنبھلو، ورنہ مٹا دیئے جاؤ گے۔

مولینا جو کچھ کہتے ہیں، یہ اُن کے محض نظریے نہیں ہیں۔ اُنہوں نے "مقدس سماجوں" "خدائی نظاموں" اور "الٰہی حکومتوں" کو ٹوٹتے دیکھا ہے۔ اور ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ سماج نظام اور حکومتیں مقدس اور الٰہی نہ تھیں، ان ناموں سے لوگوں نے اللہ کی مخلوق کو لوٹا اور اپنے شخصی اقتدار کے لئے مذہب کی آڑ لی۔ سلطان عبدالحمید ظل اللہ کہلواتا تھا معزول ہُوا اور آج اس کا خاندان دربدر پھر رہا ہے۔ امیر حبیب اللہ خان اپنے ہی وطن والوں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ زار کا جو انجام ہوا سب جانتے ہیں، بدقسمتی سے ہندوستان والے اب تک شیشے کے کمروں میں بند ہیں۔ اس لئے یہاں "مقدس" "خدائی" اور "الٰہی" القاب سے خلقِ خدا کو گمراہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے۔ انقلاب کی گھڑی قریب آ گئی ہے۔ ان ناموں سے دُنیا کو دھوکا نہ دو۔ نفس پرستی کو خدا پرستی نہ کہو۔ تمہارا یہ کھوکھلا سماج، اور بے روح تمدن چند دن کا مہمان ہے، اس کو خود بدل لو تو بہتر ہے، ورنہ زمانہ کا ریلا اُسے خود بدل دے گا۔ اور اس وقت تم کہیں نظر نہ آؤ گے۔ مولینا کی ان باتوں سے اکثر لوگ سیخ پا ہو جاتے ہیں۔ اور ان کو بُرا بھلا کہنے سے بھی نہیں جھجکتے۔ یہ لوگ جانتے نہیں کہ ان کے اردگرد دُور و نزدیک کتنے بڑے بڑے طوفان اُمڈ رہے ہیں جن کے سامنے طوفانِ نوحؑ کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔ مولینا کی دُور رس نگاہ ابھی سے ان طوفانوں کو اُٹھتا دیکھ رہی ہے۔ اور وہ اپنی قوم کو آنے والے ہولناک انجام سے ڈراتے ہیں۔

مولینا نے جس مقصد کے لئے آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے اپنا گھر بار چھوڑا تھا۔ آج اُسی مقصد کی خاطر اپنے دوستوں، نیازمندوں اور بزرگوں کو چھوڑنے

سے نہیں جھجکتے۔ جب انہوں نے اوائل عمر میں ماں کی ممتا اور بہنوں کی محبت کی پرواہ نہ کی تو اب جب کہ آپ کی عمر ستّر سے تجاوز کر چکی ہے۔ اور آپ کا ایک پاؤں قبر میں ہے۔ اور دوسری دُنیا سامنے بے حجاب نظر آ رہی ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ وہ کسی محبت عزّت یا شان کی خاطر وہ بات کہنا چھوڑ دیں۔ جسے وہ حق سمجھتے ہیں۔

الغرض مولٰینا عبید اللہ سندھی کی ساری زندگی ایک جستجو، ایک ولولہ، ایک عزم اور ایک انتھک اور مسلسل جدوجہد میں گزری ہے، اور آج بھی ستّر سال کی عمر میں وُہ جوانوں سے کہیں زیادہ ہمّت، اور مشقت سے سرگرم عمل ہیں، کبھی وہ بیت الحکمت جامونگر میں پہروں طلباء میں بیٹھے درس دیتے نظر آتے ہیں، نہ اُنہیں آرام کا خیال ہے اور نہ کھانے پینے کا ہوش۔ کڑاکے کی سردی کی پروا نہیں اور نہ جُھلستی لو کا احساس ہوتا ہے۔ کوئی استفادہ کے لئے خدمت میں حاضر ہو تو ساری رات اُس کو سمجھاتے آنکھوں میں کاٹ دیتے ہیں اور اُن پر ذرہ بھی اضمحلال کے آثار نظر نہیں آتے۔ کبھی سندھ کے ریگستانوں میں گوٹھ پیر جھنڈا کے مقام پر درس و تدریس میں لگ جاتے ہیں، وہاں زمین خریدنے کی صلاحیں ہوتی ہیں، عمارت کا نقشہ بنتا ہے، اور مادی حالات سازگار نہیں ہوتے۔ تو کھلی زمین میں جھونپڑیوں میں طلب رکو لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہمّت ہے کہ شکست قبول نہیں کرتی، اور ایمان ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ اور پختہ ہوتا جاتا ہے۔

مولینا ابوالکلام آزاد

قدرت نے بیسویں صدی کے شروع میں اسلامی ہند کو تین بڑے دل و دماغ دیئے تھے۔ اقبال، محمد علی اور ابوالکلام۔ اقبال تو الگ گوشہ میں بیٹھے اپنے شعر و فکر سے قوم کے دلوں اور دماغوں کی کھیتیوں کو سرسبز کرتے رہے۔ انہیں کئی بار کھینچ کر رزم حیات کی خار دار راہوں میں لایا گیا لیکن وہ پھر عزلت نشین ہو گئے۔ محمد علی اور ابوالکلام دونوں کے دونوں سیاست کے گرداب میں کود پڑے اور علم پر عمل کو۔ فکر پر اقدام کو۔ عزلت کی نیک نامی پر جلوت کی بدنامی کو ترجیح دی۔ اقبال نے ہمارے دلوں اور دماغوں کو ایسی غذا دی جس نے یاس اور حرمان کی ماری ہوئی قوم کو نئی زندگی بخشی۔ اور محمد علی اور ابوالکلام نے بتایا کہ آتش نمرود میں کیسے کودا جاتا ہے۔ قوم کو اقبال نہ ملتا۔ تو وہ بے روح لاشہ کی طرح ہوتی۔ لیکن اگر محمد علی اور ابوالکلام نہ ہوتے تو ہم باتیں تو خوب کر لیتے اور سوچتے بھی بہت بلند، لیکن زندگی کی دلدلوں میں کودنے کی جرأت نہ کرتے، کیونکہ ان

دلدلوں سے صرف کیچڑ کی چھینٹیں نہیں اُٹھتیں بلکہ یہ خود آدمی کو بھی اندر دبوچ لیتی ہیں۔ محمد علی اور ابوالکلام نے ہمیں یہ سکھایا کہ جس بات کو ٹھیک سمجھتے ہو کر گزرو۔ خواہ تمہیں دوسرے گالیاں دیں۔ کافر کہیں، بے ایمان بنائیں، لوگوں کی ان باتوں کو سنو تک نہیں۔

آج ابوالکلام کو ہر وہ مسلمان جس نے کبھی مسجد کا دروازہ نہیں دیکھا اور جس کی عمر آستانِ حکومت کے طواف میں گزری ہے، جو دین سے ناواقف نہیں بلکہ قطعی بے تعلق ہے خالکم بدہن کافر کہتا ہے ان پر سو سو نام دھرتا ہے۔ ان کے متعلق عجیب عجیب باتیں کرتا ہے اور کوئی گناہ اور کوئی بُرائی نہیں جو ان کی ذات سے منسوب نہ کرتا ہو اور یہ سب کچھ اُس شخص کے حق میں کیا جا رہا ہے جس نے اپنی ساری زندگی میں اپنے قلم سے، اور اپنی زبان سے، خلوت میں اور جلوت میں کبھی کسی کا نام لے کر کوئی ناسزا بات نہیں کی۔ حالانکہ وہ باتوں میں ابوالکلام ہے۔ اور اگر لکھنے پہ آئے تو اس کا قلم ذو الفقار سے کم نہیں۔ لیکن اس شخص کی عظمت اور شرافتِ نفس ملاحظہ ہو کہ وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ اور سنتا ہے لیکن خاموشی سے مُسکرا کر چُپ ہو جاتا ہے۔ بگڑتا نہیں کُڑھتا نہیں، کسی کو جلی کٹی نہیں سُناتا۔

اکثر مُسلمان ابوالکلام کی اس عظمت کے یکسر منکر ہیں اور صرف یہ نہیں کہ وہ اس عظمت کا اعتراف نہیں کرتے۔ بلکہ اس کے برعکس اُسے ذلت اور نکبت کے عمیق ترین گڑھے میں دھکیلتے ہیں لیکن یہ صرف ابوالکلام سے نہیں ہو رہا ہے ۔ محمد علی جس کو یاد کر کے آج مسلمان آنسو بہاتے ہیں، اُن کے ساتھ اس سے بھی زیادہ بُرا سلوک کیا گیا۔ اُنہیں بھی ہندو پرست کہا گیا۔ وہ بھی کافر و فاجر ٹھیرائے گئے۔ ان کو

بھی برسرِعام گالیاں دی گئیں لیکن وہ خاموش نہ رہتے تھے۔ اور مخالفوں کو ڈرتے ڈرتے برسرِنزاع آنے کی ہمت ہوتی تھی لیکن ابوالکلام کسی کا جواب نہیں دیتے۔ اس لئے ہرکس وناکس اُن کے مُنہ آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمان ابوالکلام کو یاد کیا کریں گے۔ پر ان کے مرنے کے بعد۔ کیونکہ ہماری قوم اپنے بڑے آدمیوں کو ہمیشہ یونہی یاد کرتی آئی ہے۔

بات یہ ہے کہ ان دنوں ہماری سیاسی زندگی کا کینڈا کچھ اس طرح بگڑا ہے کہ عوام تو عوام ہمارے خواص تک بھی سیاسی مسائل میں کسی قسم کے اختلاف رائے کو برداشت نہیں کرسکتے۔ بدقسمتی سے اگر کوئی شخص ان کی نظر سے گردوپیش کی چیزوں کو دیکھنے سے انکار کردے، یا اتفاق سے اُس کی عقل وفہم اُسے کوئی دُوسری بات سمجھا دے، جس کی طرف کسی وجہ سے ان کی نگاہ جا ہی نہیں سکتی، تو پھر اُس شخص کی شامت آجاتی ہے۔ وہ لاکھ عالم ہو، دنیا اُسے صاحب فراست مانا کرے اور خواہ یہ لوگ خود اُسے اب تک سرآنکھوں پر بٹھاتے آئے ہوں لیکن اس شخص کا اب اور اس وقت اُن جیسی بات نہ کہنا، اور اُن کے نقطۂ خیال سے اتفاق نہ کرنا قبیح ترین جرم سمجھا جاتا ہے۔ اور پھر اُن کے ہاتھ سے نہ اس کا علم محفوظ ہے اور ان کے نزدیک اس کی عقل وخرد کی کوئی قیمت ہے، اس کی عزّت وناموس پر حملے ہوتے ہیں۔ اس کے خلاف جھوٹے الزامات تراشے جاتے ہیں۔ لیکن ان "غیرت مندانِ ملت" میں سے کوئی خدا کا بندہ اتنی بھی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ وہ سوچے کہ آخر یہ شخص کیا کہتا ہے اور جو کہتا ہے کیوں کہتا ہے۔ کوئی ایسی بات تو ہے کہ وہ ہمارے "زندہ باد" کے نعروں سے منہ موڑ کر ہماری گالیاں سننے کے لئے تیار ہو گیا ہے۔ خدانخواستہ

اس کی عقل و خرد نے اُسے جواب نہیں دے دیا۔ اور اگر ہم اسلام اور ملّتِ اسلام کے لئے اتنا خلوص رکھتے ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ یہ شخص اسلام اور ملّتِ اسلام کو اس قدر پیچھے ڈال دے۔ لیکن ان باتوں کا کسے ہوش ہے۔ بداعتمادی کا ایک طوفان ہے کہ ہر شخص اُس میں بہا چلا جاتا ہے۔ اپنے دل، اپنے دماغ، اپنے خلوص اور اپنے دامن پر تو کسی کی نگاہ نہیں جاتی۔ فراستِ مومن کا امتحان ہوتا ہے تو دوسروں پر جو میرے مطلب کی بات کہتا ہے — اُس کی خدمتِ اسلام روزِ روشن کی طرح عیاں۔ لیکن جس نے مجھ سے الگ کوئی بات کہہ دی تو پھر اُس کی خیر نہیں۔

ہماری سیاست کی اس ہلڑ کا ان چند سالوں میں قوم کے بڑے بڑے رہنما اور مخلص خدمت گزار نشانہ بن چکے ہیں۔ لیکن ان سب میں مولینا ابوالکلام کو سب سے زیادہ بدنام کیا گیا ہے۔ اور اکسانے والوں نے سب سے بڑھ کر "جمہور" کو ان کے خلاف اکسایا ہے۔ یہ کیوں ہوا؟ بات یہ ہے کہ مولینا کی شخصی عظمت، ان کا علم و فضل اور ان کی خدمات مخالفوں کی نظروں میں سب سے زیادہ کھٹکتی تھیں۔ چنانچہ جب تک اس "نیرِ تاباں" کو خاک اُڑا کر عوام کی نگاہوں سے روپوش نہ کیا جاتا، یہ لوگ اپنی من مانی باتیں کیسے کر پاتے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ عوام کا جذباتی بخار بھی موسمی بخار کی طرح ہوتا ہے وہ چڑھتا ہے تو ہمیشہ چڑھا نہیں رہتا۔ چنانچہ اب وہ دن دُور نہیں، کہ یہ بخار اُترے اور پھر "جمہور" کا نام لینے والوں کو قدرِ عافیت معلوم ہوگی۔

مولنا ابوالکلام آزاد آج سے پچیس تیس برس پہلے جب پہلے پہل ہمارے اُفقِ سیاست پر طلوع ہوتے ہیں۔ تو اہلِ نظر نے ان کا کس طرح استقبال کیا تھا اس کی رُوداد اُردو کے صاحبِ طرز ادیب سجّاد مرحوم بی۔اے۔ ایل ایل بی (علیگ) کی زبان سے

سُنیے :-

" ایک طرف تمدّن جدید کروٹ لے رہا تھا۔ اور دوسری طرف ایک انسان کی وہ ہمہ گیر قوتیں رونما تھیں جن کی ہر جنبش کنگرۂ فرعونیت کو متنزلزل اور وقارِ نمرود کو پامال کرسکتی ہے مولینا ابوالکلام آزاد کا دماغ ان معجزات ہی سے ہے، جو کارکنانِ قضا وقدر کی حیرت انگیز کرشمہ طرازیوں کو نمایاں کرتے رہتے ہیں" الہلال" نے ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس طرح بیدار کردیا جس طرح نفخۂ صُور سے لاکھوں برس کے سوئے ہوئے انسان زندہ ہوجائیں گے۔ مذہب و سیاست کا یہ حیرت انگیز اتحاد ہندوستان میں آج تک کسی انسان کا دل و دماغ پیدا نہ کرسکا تھا اس معجز نما شخصیت نے علماء کے گروہ کو اسلامی سیاست کے رموز بتلائے اور دورِ جدید کے مبلّغین کو مذہب و اخلاق کی حقیقت۔ اس سے پہلے مختلف مصنّفین نے مختلف مواقع پر ہندوستان کے مسلمانوں کو فرائض کی تلقین کرنی چاہی تھی لیکن نہ اُن کے پاس یہ دماغ تھا اور نہ یہ دل، نہ یہ الفاظ تھے اور نہ یہ قلم۔ جامعیت ہندوستان میں کبھی اس سطوت و جبروت سے نمایاں نہیں ہوئی تھی مولینا آزاد نے مذہب کی بھی تبلیغ کی۔ اور سیاست کی بھی۔"

" روشن خیال طبقہ کو یہ پہلی بار معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن پاک میں غسل و طہارت

کے علاوہ کائنات کے حقائق بھی پوشیدہ ہیں آج تک جس انداز سے علماء قرآن پاک کو پیش کیا کرتے تھے۔ وہ کسی طور پر خوش آئند نہ تھا۔ تعلیم یافتہ طبقہ سمجھتا تھا کہ قرآن مجید ختم ہے تنبیہ و تہدید اور تکفیر اور تعزیر پر۔ خود غرض اور تنگ مایہ علما نے انہیں اسی طرح سمجھایا تھا۔ لیکن جب مولینا آزاد قرآن لے کر اٹھے مسلمان مبہوت ہو گئے۔ کہ تیرہ سو برس کے صحیفے میں حال ہی کے لئے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے نکات و حقائق پوشیدہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولینا ابوالکلام کی شخصیت ان بلند نظر شخصیتوں میں سے ہے جن کی عظمتوں کا محاصرہ نہیں کیا جا سکتا۔ دورِ جدید میں اگر مذہب کو کسی نے سیاست سے صحیح طور پر ملا دیا ہے، اور علما کے کھوئے ہوئے اقتدار کو دوبارہ حاصل کر لیا ہے تو وہ تنہا مولینا ابوالکلام ہیں۔ اقبال کو جب پڑھتا ہوں خدا یاد آجاتا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا یا مولینا ابوالکلام کی نثر اس کے لئے منتخب کی جاتی یا اقبال کی نظم"۔

پیغمبری صرف مذاہب تک محدود نہیں، زندگی کے ہر نظام میں ایک حقیقی پیمبر ہوتا ہے۔ اقبال جب لکھتے ہیں "مرا حرفے نست در دل" تو میں اُن پر اُسی خلوص سے ایمان لاتا ہوں جس طرح روحیں پیمانِ الست" کے سلسلے میں ایمان لاتی تھیں۔ میں تنہا اخلاقی سیرت کا قائل نہیں اگر کوئی دل رکھتا ہے، اور دماغ بھی۔ اُسے میں ان تمام ہستیوں پر ترجیح دیتا ہوں جن کی عمریں محض محاسن کے ارتکاب میں ضائع ہوتیں۔ میرے نزدیک

اقبال اور مولینا ابوالکلام حقیقی معنوں میں فوق البشر ہیں۔"
۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامے کے بعد سر سید نے مسلمانوں کے لٹے ہوئے قافلے کو ایک سہارا دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی جماعتی زندگی کو اُس وقت اس سہارے کی اشد ضرورت تھی۔ اور اگر خدانخواستہ سرسید علیہ الرحمۃ کی وسعت نظر سیاسی تدبر مصلحت بینی اور عالی حوصلگی آڑے نہ آتی تو معلوم نہیں ہماری قوم آج کن تنگنائیوں میں کھٹک رہی ہوتی۔ لیکن سرسید نے اس افراتفری اور انتشار کو روکنے کے لئے جو کچھ کیا تھا اُس کی حیثیت محض ایک سہارے کی تھی۔ سرسید خوب جانتے تھے کہ قومیں کسی دوسرے کے سہارے پر جی نہیں سکتیں۔ اور بفرض محال اگر وہ جئیں بھی تو ایسا جینا زندگی کے لئے باعث ننگ ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے سرسید کے بعد اُن کے جانشینوں نے اس سہارے کو جو ظاہر ہے عارضی اور اُس وقت کی مصلحت کا تقاضا تھا۔ اسلامی ہند کی سیاست کا ناقابلِ تغیر اساس بنا لیا۔ اس کا نتیجہ قدرتی طور پر جو نکلنا تھا وہ نکل کر رہا۔ چنانچہ ہمارے انگریزی پڑھے طبقوں کی ساری جدوجہد ان کے علم و فکر اُن کی تمام اُمیدوں اور آرزوؤں کا حاصل اور ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا انگریزی حکومت اور اس کی خوشنودی قرار پایا۔ ابوالکلام محمد علی اور اقبال کے اس احسان سے ملتِ اسلامیہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی کہ ان تینوں کے فکر و علم اور عمل نے ہندوستانی مسلمانوں کو جن کے لئے انگریزی حکومت کا "پردہ عماری" ہی ان کی "نگاہ نیاز" کا قبلہ مقصد بن چکا تھا۔ اس گمراہی سے نکالا۔ آج بے بصروں کے نزدیک اگر ابوالکلام "مردود" ہے تو اس سے مولینا ابوالکلام کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آسکتا یہ دراصل ان لوگوں کی سطحی نظر کا تصور ہے۔ ورنہ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے ابوالکلام، محمد علی اور اقبال تینوں کے تینوں ہماری ملت کے سب سے بڑے محسن ہیں۔ اور ان کی ذات

سے صرف ہندوستانی مسلمانوں کو فیض نہیں پہنچا بلکہ انہوں نے کل ہندوستان کی فکری، علمی اور سیاسی زندگی میں ایسے نقوش چھوڑے ہیں۔ جن کا ہر مورخ کو کھلے دل کر اعتراف کرنا ہوگا۔

ابوالکلام سے آج اگر مسلمانوں کو شکایت ہے تو صرف یہ ہے کہ مولینا کانگریس میں کیوں ہیں؟ موصوف کے اس "گناہ" نے ان کی خدمتیوں کو مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ وہ بھول گئے ہیں کہ اس صدی کے اوائل میں ان کو خواب غفلت سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگانے والا، اور ان کے دماغوں اور دلوں کے زنگوں کو کھرچ کھرچ کر صاف کرنے والا ابوالکلام ہی تھا۔ اسی ابوالکلام کے "الہلال" اور "البلاغ" نے اسلامی ہند کی سیاست - رجعت پسندی کو پسپا ہونے پر مجبور کیا، آگے بڑھنے والوں کو للکارا، اور ان میں قوم کو اپنے ہاتھ سے چلنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ ابوالکلام نے ہمارے دماغوں کو آزاد کیا۔ اس نے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق تازہ اور جاندار تصورات دیا۔ اس نے ہمارے دلوں میں خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی جرأت پیدا کی۔ ابوالکلام نے ہمیں نیا طرز بیان عطا کیا۔ اس کی تحریر سے ہمارے لکھنے والوں نے نئے نئے اسلوب سیکھے۔ ابوالکلام نے اپنے "ترجمان القرآن" کے ذریعے ان لوگوں میں جو قرآن سمجھنے کا شوق پیدا کیا جو کبھی بھی اس کتاب کے پاس نہ پھٹکتے۔

اب رہا مولینا کا یہ گناہ کہ وہ کانگریس میں کیوں ہیں؟ سو یہ گناہ تو ایسا ہے کہ آج جن بڑے بڑے زعما و قائدین کو مسلمان پوج رہے ہیں اور ان کے لئے زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگاتے نہیں تھکتے یہ سب کے سب بھی کسی زمانے میں کانگریس میں رہ چکے ہیں اور بعید از قیاس نہیں ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آئے کہ ان میں سے اکثر مسلمانوں کو پھر اسی گناہ کا ارتکاب کرتے نظر آئیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی کو ایک زمانے سے اہلِ ملک جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے "شیخ الجامعہ" یعنی پرنسپل کی حیثیت سے جانتے آئے ہیں، اِدھر دو تین برس سے "واردھا تعلیمی سکیم" یا صحیح معنوں میں "بنیادی تعلیمی اسکیم" کے بنانے والوں کے صدر ڈاکٹر ذاکر کا بہت چرچا ہوا ہے۔ اسکیم کے حامیوں نے اُنہیں ہندوستان کا سب سے بڑا ماہرِ تعلیم مانا۔ اور اُس کے مخالفوں نے اُنہیں جو اُن کے جی میں آیا کہا۔ مخالف سب کے سب مسلمان تھے۔ اور شاید ڈاکٹر ذاکر کی شخصیت نے اُنہیں ایک گونہ عقیدت بھی دی تھی۔ اور وہ اُن کی خوبیوں اور ایثار کے معترف بھی تھے۔ لیکن سوال تھا اُن کے نزدیک تمام مسلمان قوم کا۔ اور مخالفین کا کہنا یہ تھا کہ بنیادی تعلیم کی اسکیم سے مسلمانوں کی قومی زندگی کو بہت سخت قسم کے نقصانات پہنچنے کا اندیشہ ہے بہرحال یہ مسئلہ ایک حد تک تعلیمی ہے اور بہت حد تک سیاسی۔ دونوں فریق نہایت خلوص سے اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں

اور اب ان میں حکم بننا اتنا آسان نہیں۔ ہم یہاں ڈاکٹر ذاکر کی صرف اُس حیثیت سے بحث کرنا چاہتے ہیں جس پر کسی کو کوئی اختلاف ہی نہیں ہو سکتا۔ اور وہ ہے ڈاکٹر صاحب بحیثیت ایک ادیب کے۔

موصوف کو شیخ الجامعہ اور صدر بنیادی تعلیمی اسکیم کے نام سے تو شاید ہی کوئی پڑھا لکھا ہو جو نہ جانتا ہو لیکن یہ کہ ڈاکٹر ذاکر ایک بے نظیر مقرر اور بے مثل ادیب بھی ہیں بہت ہی کم لوگوں کو معلوم ہوگا۔ وہ طبعاً "خلوتی" ہیں "جلوتی" نہیں۔ وہ تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کے ہنگامہ خیز دور کی پیداوار ہیں۔ اور اسی بات نے انہیں ہنگاموں سے متنفر اور اشتہار بازی سے بے نیاز بنا دیا ہے وہ مجمعوں میں نہیں بولتے۔ اور نہ عام تشہیر کے لئے لکھتے ہیں اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ گمنام رہنا چاہتے ہیں یا انہیں اپنی عظمت کا احساس نہیں، بات یہ ہے کہ آج کل بازارِ شہرت میں کھوٹی اور ملمع کی چیزیں ظاہری سج دھج سے نظروں کو خیرہ کر رہی ہیں، موصوف کو اس راہ سے منظرِ عام پر آنا ناپسند ہے وہ "مائل بہ تغیر" قدروں کے قائل نہیں، وہ ابدی قائم بالذات قدروں کو مانتے ہیں۔ اور انہیں پر اپنی آئندہ بڑائی کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر کی شخصیت کے یہ جوہر آپ کو ان کی تقریروں اور تحریروں میں ملیں گے اور اس لئے ضرورت ہے، کہ ہم ان کو بحیثیت ادیب کے جانیں اور سمجھیں۔

یہاں ہم ڈاکٹر ذاکر کی ادبی شخصیت کا تجزیہ نہیں کریں گے۔ یہ بحث ہم کسی اور وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ وہ کیا ہیں؟ یہ ہم اس وقت نہیں بتا سکتے۔ ہاں! وہ کیا کہتے ہیں؟ یہ ہم یہاں بتانا چاہتے ہیں ڈاکٹر ذاکر اردو میں لکھتے ہیں اور حتی الامکان اردو ہی بولتے ہیں۔ اور انگریزی بولتے یا لکھتے ہیں تو ضرورتاً۔ اُن کا خاص مضمون جس میں انہوں نے برلن کی یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری لی۔ معاشیات ہے۔ لیکن اُن کا مطالعہ بہت وسیع ہے

اس لئے ان کی تحریروں میں تمام ہمہ گیری ہے لیکن یہ ہمہ گیری محض کتابوں سے مستفاد نہیں بلکہ زندگی کے نشیب و فراز سے ماخوذ ہے۔ ڈاکٹر ذاکر کا احساس بہت تیز ہے اور قوت فکر بڑی جولاں۔ اس طبیعت کا آدمی اکثر حقائق کے مقابلہ میں اپنی فکر کی دنیا بنا لیتا ہے اس کی پرواز عرش بریں سے بھی پرے تک جاتی ہے وہ یزداں کو بے شک "کمند" میں لے آتا ہے لیکن یہ دنیا کوتاہیوں کی دنیا ہے غلطیوں اور ناتوانیوں کی دنیا، مکر و ریا کی دنیا، خلوص و ایمان کی دنیا، کبھی ظلمت اور کبھی نور کی دنیا کی الجھنوں اور گتھیوں کو وہ نہیں سمجھتا۔ ڈاکٹر ذاکر اپنی طبیعت کی اس افتاد سے واقف تھے۔ انہوں نے اپنی طبیعت کے خلاف زبردستی، ریاضت اور مجاہدہ کے طور پر حقائق کی دنیا میں اپنی جگہ بنائی۔ اور سالہا سال انہوں نے علم و ادب کی بلند پروازیوں یا دوسرے لفظوں میں ذہنی کاوشوں سے دور ہٹ کر ٹھوس زندگی کو اپنی تمام سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ چودہ برس ہونے کو آئے وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پرنسپل ہیں جامعہ کے پرنسپل کے معنی یہ نہیں کہ وہ صرف تعلیم کا صدر اور نگران ہے، بلکہ اس کی حیثیت ایک ایسے مالی کی ہے جو خود ہی زمین تیار کرتا ہے۔ بوٹے بھی وہی لاتا ہے۔ پانی کا بھی وہی انتظام کرتا ہے۔ بیج کا انتخاب بھی اسی کے ذمہ ہے۔ اور باغ کی حفاظت اور نگرانی بھی اسی کا کام۔ ظاہر ہے جو مالی یہ کرے گا اس کی نظر کتنی حقیقت رس اور عملی ہوگی۔ چنانچہ جامعہ نے ڈاکٹر ذاکر "صاحب فکر" کو ذاکر "صاحب عمل" بنا دیا ہے۔ اب ان کے ادب میں ایک طرف اگر یزدانیت ہے جو ان کی خداداد ذہانت اور فطری طباعی کا حاصل ہے تو دوسری طرف زندگی کی حقیقت اور مادیت ہے جو جامعہ اور ماورائے جامعہ کی ٹھوس اور عملی دنیا کے تجربات سے انہیں ملی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر کا اکثر وقت جامعہ کے انتظام و اہتمام اور بیرون جامعہ کے تعلیمی معاملات

کو سلجھانے میں صرف ہوتا ہے کہ ان کو پڑھنے کے لئے بہت کم وقت ملتا ہے اور لکھنے
کے لئے اس سے بھی کم تر۔ لیکن جب کبھی وہ لکھتے ہیں یا تقریر کرتے ہیں تو سخت مجبوری کی
حالت میں۔ یہ مجبوری اُن کی تقریر اور تحریر میں واقعیت پیدا کردیتی ہے اور یہ وصف
خاص ہے ڈاکٹر ذاکر کی ادبی استعداد کا۔

اُن کی تقریریں بیشتر جامعہ کی مجلسوں یا جلسوں میں ہوتی ہیں۔ کوئی اُن کو
لکھتا نہیں۔ ہاں ان کی تحریریں رسالوں یا کتابوں کی شکل میں شائع ہوجاتی ہیں۔
ایک زمانہ تک موصوف رسالہ جامعہ میں "رفتارِ دُنیا" کے عنوان سے ہر مہینے
کچھ نہ کچھ لکھتے تھے۔ یورپ اور دوسرے ملکوں کی سیاست پر اس سے بہتر اُردو میں
شاید لکھا گیا ہو، یہ مباحث گو وقتی ہوتے۔ لیکن جس انداز سے ان پر بحث ہوتی تھی
وہ ان وقتی چیزوں کو مستقل بنا دیتا تھا۔ بچوں کے لئے آپ نے چھوٹی چھوٹی کہانیاں
بھی لکھی ہیں۔ زبان بالکل بچوں کی ہے۔ اور موضوع بھی بچوں کی پسند کا لیکن بات
اتنی گہری کہہ جاتے ہیں کہ بڑے بھی ان کو پڑھ کر سوچنے لگتے ہیں۔ ایک کہانی "ماں"
ہے۔ ماں کی ممتا کی تصویر شاید دُنیا کے کسی ادب میں اتنی مؤثر نہ کھینچی گئی ہو۔ مرغی اجمیر
چلی، عقاب، کچھوو غیرہ کہانیاں مکتبہ سے شائع ہوچکی ہیں۔ آپ کی تصنیفات
میں سے "مبادیٔ معاشیات" معاشیات کی کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس سلسلہ
میں موصوف کی اہم تصنیف "معاشیات:۔ مقصد اور منہاج" ہے یہ مقالہ آپ نے
ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے کسی جلسہ میں پڑھا تھا۔ کتاب کے نام سے یہ نہ
سمجھ لیا جائے کہ یہ معاشیات کے محض اصطلاحی علم کی کوئی کتاب ہے۔ مصنف
نے اس کتاب میں ایک بنیادی بحث اٹھائی ہے۔ کارل مارکس کے مادی فلسفے

سے یہ عقیدہ عام ہو چلا ہے۔ کہ عقل ہی ایک ایسی کسوٹی ہے، جو انسان کی زندگی کے سارے معیاروں پر حاکم ہے۔ خالص دلیل اصل چیز ہے۔ جذبات اور عقائد جن کی بنیاد خالص عقل پر نہ ہو وہ قابلِ التفات نہیں۔ مصنف نے اس کتاب میں اس اصول پر نہایت مفصل بحث کی ہے۔ یہ کتاب ہر طالب علم کے لئے خواہ اس کا مضمون معاشیات نہ بھی ہو مفید ہے۔ لیکن ڈاکٹر ذاکر کا اصلی کارنامہ جو اُن کی ادبی زندگی کو زندہ جاوید بنا دیگا۔ وُہ ان کا ترجمہ ہے افلاطون کی مشہور و معروف کتاب "ریاست" کا۔ افلاطون اور ارسطو ہزار ہا سال سے دنیا کی مختلف قوموں کے دلوں اور دماغوں پر حکومت کرتے چلے آرہے ہیں۔ مسلمان فلسفی اور صوفی دونوں ان سے متاثر ہوئے۔ ڈاکٹر ذاکر طبیعتاً افلاطونی ہیں۔ ریاست کا مقدمہ پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون خود بول رہا ہے اور کتاب دیکھیں تو ترجمہ نہیں معلوم ہوتی۔ شاید افلاطون اور ڈاکٹر ذاکر میں بہت سی خصوصیات مشترک ہوں گی۔ چنانچہ اصل مصنف کی روح نے مترجم کی ذات میں یوں حلول کیا ہے کہ قارئین کے لئے مصنف اور مترجم میں فرق کرنا مشکل ہے۔ اور افلاطون کی "ریاست" ڈاکٹر ذاکر کی "ریاست" بن گئی ہے۔

کتاب کی زبان اور اس کا اندازِ بیان کم سے کم اُردو میں تو بے مثل ہے۔ کتاب ساری مکالموں میں ہے۔ اور ترجمہ کی خوبی یہ ہے۔ کہ وہ مکالمے خود ڈاکٹر ذاکر کے اپنے معلوم ہوتے ہیں یعنی ان کی اپنی بات ہے جو وہ اپنے دوستوں اور شاگردوں سے کہہ رہے ہیں۔ وہی بات ہے، کہنے کا وہی ڈھنگ ہے اگر ہم تناسخ کے قائل ہوتے تو ضرور کہتے کہ افلاطون کی روح نے دوبارہ ریاست کے "اردو مترجم" کا جنم لیا ہے۔ اور شاید یہ بات ہو بھی سچ۔ افلاطون کے عہد کا یونان کم سے کم ذہنی

اور سیاسی انتشار میں اسلامی ہند سے بہت حد تک ملتا جلتا ہے۔

آخر میں ہم موصوف کے ایک ایڈریس کا ذکر کرکے اس بیان کو ختم کرتے ہیں، گزشتہ اپریل میں جامعہ نگر میں دوسری بنیادی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر ذاکر اس کے صدر تھے۔ موصوف نے افتتاحی تقریر کی جو رسالہ کی صورت میں ہمارے پیش نظر ہے۔ کاش یہ ممکن ہوتا کہ ہم اس تقریر کے جستہ جستہ حصے نقل کرسکتے، مجبوراً اس کے صرف ایک حصہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

"خدا کے لئے اس ملک کی سیاست کو سدھاریئے اور جلد سے جلد ایسی ریاست کی طرح ڈالئے جس میں قوم قوم پر بھروسہ کرسکے۔ کمزور کو زور آور کا ڈر نہ ہو غریب امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے جس میں تمدن تمدن ان کے ساتھ پھولے پھلیں پھول سکیں اور ہر ایک سے دوسرے کی خوبیاں اجاگر ہوں۔ جہاں ہر ایک وہ بن سکے، جس کے بننے کی اس میں صلاحیت ہے اور وہ بن کر اپنی ساری قوت کو اپنی سماج کا چاکر جانے۔ میں جانتا ہوں کہ ان باتوں کا کہہ دینا سہل ہے اور کرنا کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آج یہ بات ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ہاتھ میں اتنی ہے جتنی کہ پہلے کبھی نہ تھی کہ کچھ سمجھ کر کچھ سمجھا کر کچھ مان کر کچھ منوا کر ایسی ریاست کی نیو رکھ دیں۔ جب تک یہ نہیں ہوتا ہم تعلیمی کام کرنے والوں کا حال قابل رحم ہے۔ ہم کب تک اس سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں؟ کب تک غصہ اور بدگمانی کے دھوئیں میں تعلیم کو دم گھٹ گھٹ کر سسکتے دیکھیں؟ کب تک ہم اس ڈر سے ضرتے رہیں کہ ہماری عمر بھر کی محنت اور عمر بھر کی محبت کو کوئی ایک سیاسی حماقت، کوئی ایک سیاسی ضد بھسم کر دے گی؟ ہمارا کام بھی

کوئی پھولوں کی سیج تو ہے نہیں۔ اس میں بہت مایوسیاں ہوتی ہیں اور اکثر
دل ٹوٹتا ہے، پھر جب ہم ایسے قدم ڈگمگائیں تو ہم کہاں سہارا ڈھونڈیں؟
کیا اسی سماج میں جس میں بھائی بھائی یکدل نظر نہیں آتے، کوئی قدر آخری قدر
نہیں معلوم ہوتی جس میں کوئی گیت نہیں جو سب مل کر گائیں۔ کوئی تہوار
نہیں جو سب مل کر منائیں کوئی شادی نہیں جسے سب مل کر رچائیں کوئی دکھ نہیں جسے سب
بٹائیں۔ ہماری یہ مشکل دور کیجیے۔ ابھی بہت دیر ہو چکی ہے اور دیر نہ جانے کیا دن دکھائے؟"

اسی مسئلہ کے متعلق موصوف کی کچھ اور باتیں ابھی سن لیجیے۔ کچھ عرصہ ہوا آپ نے
بنارس کی قومی یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔
"جب ذات پات، مذہب، زبانوں کے فرق سے ہمارا دیس ٹکڑے ٹکڑے نظر آتا ہے جس
ملک میں اسٹیشنوں پر مسلمان پانی اور ہندو دودھ ملتا ہے جس دیس میں مختلف قسم کی نسلیں بستی ہیں،
جہاں بالکل مختلف انداز کے تمدن ساتھ ساتھ رائج ہیں۔ جہاں ایک کا سچ دوسرے کا جھوٹ
ہے۔ جہاں بت پرست اور بت شکن کو قدرت نے ساتھ ساتھ دکھ سکھ کے لیے ساتھ جینے
اور ساتھ مرنے کے لیے یکجا کر رکھا ہے۔ اس ملک میں نوجوانوں سے ایسے مل کر کام
کرنے کی آس ذرا مشکل ہے۔ مگر دل بھی گواہی دیتا ہے کہ تھوڑے دن اور دھکے کھانے
کے بعد اس ملک کے نوجوان دیس کی سیوا کے لیے یکدل ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ میرا عقیدہ
ہے کہ ہندوستان کی قسمت میں قدرت نے یہ بات رکھی ہے کہ یہاں بالکل مختلف قسم کے انسانی نمونے
ایک دوسرے سے مل کر ایک ایسا آدم تیار کریں جو تہذیب اور تمدن کی ایک نئی تشکیل کر سکے۔
قدرت کے اس تجربہ اور قدرت کے اس ارادے میں اس کی مدد کرنا تمہارا کام ہے اور اس
مدد کے لیے اپنے آپ کو اچھا آدمی بنانا اور اپنے دل کو کینہ کپٹ سے خالی کرنا لازمی ہے۔"
یہ مشن ہے ڈاکٹر ذاکر کا اور وہ اسی لیے زندہ ہیں اور اسی کے حصول کی خاطر
سرگرم کار ـ

مولانا حسرت موہانی

اردو میں بہت بڑے بڑے شاعر ہوئے ہیں۔ میر کے نشتروں کا جواب اب تک کسی سے بن نہیں آیا۔ غالب و اقبال نے تو شاعری نہیں پیغمبری کی ہے۔ انہوں نے شعر کو حکمت کا لباس بخشا، یا یوں کہیے کہ حکمت کو شعر کی دل آویزی دی۔ اور اس سے دلوں کو گرمانے اور دماغوں کو جلا دینے کا کام لیا۔ داغ نے ہوس و عشق کے معاملات کو ایسی زبان میں ادا کیا کہ ان کا ہر شعر شباب کی ایک زندہ تصویر بن گیا۔ اور تصویر بھی ایسی شوخ اور اس قدر مست کرنے والی کہ آدمی دیکھے اور بے قابو ہو جاتے۔ الغرض میر، غالب، اقبال اور داغ اپنے اپنے رنگ میں بادشاہ سخن ہیں۔ چنانچہ ہر ایک کی شاعری اپنی اپنی طرز میں کمال کے مرتبہ کو پہنچی گو اردو میں شاعر اور بھی ہوئے۔ اور ان میں سے بہت بڑے باکمال بھی ہیں۔ پر انہیں ان بزرگوں کا درجہ نصیب نہیں ہوا۔

لیکن موجودہ شعرا میں حسرت موہانی نے اپنی ایک خاص راہ نکالی ہے حسرت

غزل کہتے ہیں اور غزل ہی ان کی ساری کائنات ہے۔ غالب اور اقبال کی سی حکمت حسرت کے اشعار میں سرے سے نہیں ملیگی۔ حسرت صرف حسن و عشق کے ترجمان ہیں قدرت نے اُنہیں بظاہر حسن کی دولت سے محروم رکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان کا ناک نقشہ، شکل و صورت، رنگ ڈھنگ، بات چیت اور کے اور طرز میں شاید ہی کسی کو کوئی حسن نظر آئے۔ لیکن کارکنانِ قضا و قدر نے اس کمی کی تلافی یوں کی ہے کہ شاعر کے باطن میں حسن و عشق کی گویا کہ دنیائیں بسا دی ہیں۔ حسرت کے بیان کی رنگینی، ترکیبوں کا اچھوتا پن، اور الفاظ کی مٹھاس اُن کے گہرے احساس حسن کا پتہ دیتے ہیں۔ اور پھر حسرت کا عشق بھی بڑا لطیف اور شیریں ہے۔ بے شک حسرت کا معشوق شوق و رغبت، لذتِ وصال اور خلشِ انتظار، شادمانی و محرومی، حسرت پابوسی اور عتاب و سرزنش کے جذبات ضرور پیدا کرتا ہے۔ لیکن یہ جذبات اتنے دلخراش نہیں ہوتے۔ اور نہ ان میں آتشِ دوزخ جیسی گرمی ہے کہ فراق کی نوبت آئے تو جسم کے ساتھ جی بھی جل جائے۔ اور اگر خدا وصال ارزاں کردے تو شبِ وصال میں بھی ہجر کا تصور شاعر کو بےچین رکھے۔ اس کے برعکس حسرت کے جذباتِ عاشقی میں اذیت کی بجائے لذت کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اذیت کا سراغ حسرت کے اشعار میں بمشکل ملیگا۔ اس کے الم فراق میں بھی میٹھی کڑواہٹ ہے اور اُس کے شوقِ وصال کی شیرینی کا پوچھنا ہی کیا ہے۔

حسرت نے شوقِ وصال، نظارۂ جمال، بے قراریِ دل و نظر اور ہجر و فراق کی تپش کے اظہار کے لئے الفاظ اور پیرایہ بیان بھی ایسا اختیار کیا ہے جس میں سرتاپا حسن ہی حسن ہے۔ اس میں شہد کی سی مٹھاس ہے! اور بادِ صبا کی سی مہک جو صبح کے

وقت جسم و روح کے ریشے ریشے کو تازگی بخشتی اٹکھیلیاں کرتی بلاغ میں سے گزر جاتی ہے
حسرت کے اظہارِ محبت میں جرأتِ رندانہ سے زیادہ اشتیاق کی گھلاوٹ ہے۔ بات دراصل
یہ ہے کہ حسرت کا معشوق اردو کے عام شعرا کے دستور کے مطابق بازاری نہیں۔ حسرت
کے دل میں اپنے معشوق کا احترام بھی ہے۔ چنانچہ حسن و عشق اور احترام کے ساتھ پوری پوری
وارفتگی بھی۔ جذبات و کیفیات کا یہ سرچشمہ ہے۔ جس سے حسرت کی شاعری کی سوت پھوٹتی
ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُس کے ہاں نادے سے زیادہ نور، تندی سے زیادہ لطافت جلن
سے زیادہ میٹھے میٹھے درد کی کسک ہے، اور حسرت کی ایسی کیفیتِ باطنی کے آئینہ دار اس
کے اس طرح کے اشعار ہیں :-

گلشنِ حسن میں ہیں نور کی نہریں جاری   یا رواں عارضِ جاناں کے کنارے آنسو

بے شک شاعر کے دل میں اپنے معشوق کا احترام ہے اور وہ اُس کی عزت بھی کرتا ہے
لیکن وا ہے اُس کا معشوق ہی یعنی وہ شاعر کے شوقِ وصال کا مقصود ہے یوں سمجھئے
کہ داغ کے ہاں جذبۂ جنسی کم و بیش اپنے اصلی رنگ میں دانود ہے لیکن حسرت کے ہاں
یہ جذبہ ارفع یعنی (SUBLIME) ہوگیا ہے جذبہ کی ایسی پاکیزگی اور رفعت نے
حسرت کی غزل کو اردو میں ایک خاص امتیاز دے دیا ہے۔
حسرت کا دوسرا کمال یہ ہے کہ اِن لطیف جذبات کو ادا کرنے کے لئے اُسے قدرت
نے لطیف زبان بھی عطا کی ہے حسن و محبت کی دل گداز داستان کو اتنے شیریں ہجوں
میں زبانِ قلم سے پیش کرنا یہ حسرت ہی کا حصّہ ہے۔ حسرت کی پوری کی پوری غزلیں
مرصّع ہیں۔ آپ پوری غزل پڑھ جائیے آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ شاعر نے سرمستی و بیخودی
کی کیفیت میں ڈوب کر ساری کی ساری غزل کہی ہے۔ خیالات میں عجیب روانی ہے

آورد کا کہیں نشان نہیں۔ الفاظ ہیں کہ بے ساختہ نکلے پڑتے ہیں اور ترکیبیں اتنی دلکش اور حسین ہیں اور اُن کے جوڑ بند اس اُستادی سے ملائے گئے ہیں کہ ایک ایک شعر کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

مستی کے پھر آ گئے زمانے — آباد ہوئے شراب خانے
ہر پھول چمن میں زرِ بکف ہے — بانٹے ہیں بہار نے خزانے
سب ہنس پڑے کھلکھلا کے غنچے — چھیڑا جو لطیفہ صبا نے
سرسبز ہوا نہالِ غم بھی — پیدا وہ اثر کیا ہوا نے
رندوں نے پچھاڑ کر پلا دی — واعظ کے نہ چل سکے بہانے
مسکن ہے قفس میں بلبلوں کا — ویران پڑے ہیں آشیانے

اس غزل کا ایک ایک شعر دیکھئے۔ ایک سے ایک دلکش اور تابناک۔ اور پھر پوری غزل "زمانۂ مستی" کی کتنی زندہ اور کس قدر زندگی بخش تصویر ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ بادِ بہار سامنے "نہالِ غم" کو سرسبز کر رہی ہے۔

صرف اس ایک غزل پر کیا مدار ہے؟ یوں ان کے پہلے چار حصے جو بیشتر حسرت کی جوانی کے کلام پر مشتمل ہیں، اس طرح کی غزلوں سے بھرے ہوئے ہیں جی چاہتا ہے۔ کہ آدمی انہیں بار بار پڑھے اور مزے لے۔ ایک اور غزل کے چند اشعار سُنیے۔

نامرادوں کو شاد کام کرو — کرم اپنا کبھی تو عام کرو
کارِ عاشق ہے ناتمام سو تم — قتل کر کے اُسے تمام کرو

پوچھتے ہیں وہ جاں نثاروں کو
تم بھی حسرت اٹھو، سلام کرو

حسرت نے حُسن کی دل کشیوں کو خوب آزمایا ہے اور عشق کے حوصلوں اور شوق کے ولولوں سے بھی ان کو عمر بھر پالا پڑا ہے۔ اردو شاعری کی خوش قسمتی تھی کہ ان تاثراتِ حُسن اور تجرباتِ عشق کے بیان کے لئے حسرت کو حسنِ بیان بھی اس اعلیٰ پایہ کا ملا۔

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بے تابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے
مہر ذرّوں کو کیا قطروں کو دریا کر دیا

سب غلط کہتے تھے لطفِ یار کو وجہِ سکوں
دردِ دل اُس نے تو حسرت اور دُونا کر دیا

حسرت کا یہ رنگِ سخن اردو شاعری میں اپنا ایک الگ انداز رکھتا ہے۔ اور اس کی شان استادانِ سخن سے ممتاز ہے۔ حسرت نے اس معاملہ میں کسی خاص استاد کے طرز کا تتبع نہیں کیا۔ چنانچہ ایک طرف تو وہ فرماتے ہیں ؎

غالبؔ و مصحفیؔ و میرؔ و نسیمؔ و مومنؔ
طبعِ حسرتؔ نے اُٹھایا ہے ہر اُستاد سے فیض

اور اس کے ساتھ ہی اُن کو اس امر کا بھی اعتراف ہے۔ کہ نظمِ حسرت کی مستی اور بے ساختگی ع "پرتو نقشِ سعدی و جامی" ہے۔

اُردو کا یہ شیریں بیان حُسن شناس اور عاشق مزاج شاعر سیاست کی بھول بھلیوں میں پڑ کر ایک عرصہ سے دنیائے شعر سے ہجرت کر چکا ہے۔ عام طور پر شاعروں کو سیاست کی فضا شاذ و نادر ہی راس آتی ہے۔ اب مولینا حسرت موہانی کا حال یہ ہے کہ سال کے چھ مہینے تو سفرِ حج کی آمد و رفت میں صرف ہوتے ہیں اور باقی کے چھ

یعنے ہندوستان کی سیاست کی بے کار بحثوں میں ادب و شعر سے اُن کی دلچسپی تو شاید اب بھی باقی ہو۔ لیکن اُن کا تازہ کلام بڑی مدت کے بعد کہیں دیکھنے میں آیا ہے البتہ مسلم لیگ کی سیاست کے متعلق اُن کے بیانات اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مولینا حسرت ایک مجموعۂ اضداد ہیں۔ وہ کٹر پیر پرست ہیں اور پھر سوشلسٹ ہیں۔ مولینا سیاست میں ہمیشہ سے انتہا پسند رہے ہیں۔ وہ اُس وقت کانگرس میں تھے جبکہ خال خال کوئی مسلمان کانگرس کا رُخ کرتا تھا۔ اور پھر کانگرس میں بھی وہ بائیں بازو کے سب سے تیز اور جوشیلے رکن سمجھے جاتے تھے۔ اور ان دنوں وہ لیگی ہیں۔ شعر وسخن زندگی کا وظیفہ اور پھر حسن و عشق کی کیفیات کو اس شدت اور خلوص سے محسوس کرنے والا شاعر اور بی اے کے بعد علی گڑھ میں کپڑے کی دُکان کھول لے حُسن کی رنگینیوں، جذبات کی لطافتوں اور عشق کی سرفروشیوں کو اتنے شیریں اور رسیلے بولوں میں ادا کرنے والا اور برسوں جیل کی کال کوٹھڑیوں میں زندگی کاٹے اور چکی کی مشقت کرے۔ الغرض مولینا حسرت موہانی کی طبیعت اک "طرفہ تماشہ" ہے اور چکی کی مشقت کے ساتھ ساتھ زندگی کے لطیف ترین احساسات اور بہار حسن کی لذت کوشیوں کو نبھانا۔ واقعی موصوف ہی کا حصہ ہے۔

سویت آپ کا مقصد، بغاوت آپ کا مسلک
مگر اس پر بھی حسرت کی غزل خوانی نہیں جاتی

جوش ملیح آبادی

حضرت جوش ملیح آبادی اُردو کے بڑے شاعروں میں سے ہیں۔ اس وقت تک آپ کے کوئی چھ دیوان شائع ہو چکے ہیں اور شاید نئے پُرانے کلام کے دو تین مجموعے ابھی اور زیرِ طبع ہیں۔ جو اُمید ہے جلدی ہی چھپ جائیں گے۔ حضرت جوش بہت لکھتے ہیں اور ہر موضوع پر لکھتے ہیں کوئی سیاسی مسئلہ ہو کسی اقتصادی نظریہ کا ذکر ہو۔ مذہب کی بحث ہو۔ فلسفہ کی کوئی گتھی۔ اس دنیا کی بات ہے فرشتوں اور خدا سے معلا ہو جوش صاحب ایک ہی انداز میں سب پر سخن سرا ہوتے ہیں۔ ان کی 'فکر و نشاط' کو لیجیے۔ کتاب کے کوئی ۱۱۴ صفحے ہیں۔ اور کم و بیش ۸۲ موضوع ہیں جن پر حضرت جوش نے طبع آزمائی کی ہے۔ "حرف و حکایت" ایک اور کتاب ہے۔ جس کے ۱۳۲ عنوان ہیں اور تقریباً ۸۴۲ صفحے۔ ایک مجموعہ رباعیات کا ہے۔ اسی طرح "شعلہ و شبنم" اور "نقش و نگار" نام کے دیوانوں میں آپ نے ہر موضوع پر اور ہر رنگ میں شعر کہے ہیں اور ان کا آخری

کا اس طرح کا کلام اکھڑا اکھڑا ہوتا ہے۔ نہ معانی میں ربط ہوتا ہے نہ اس میں کوئی فکر مسلسل۔ اور الفاظ بے جوڑ، موٹے موٹے ثقیل اور ترکیبیں اکثر ان گھڑ۔ ان میں سلاست نام کو نہیں ہوتی۔ اور مطالب میں نہ گہرائی ہوتی ہے اور نہ عمومیت اور وسعت۔ ان کی اس طرح کی اکثر نظمیں پڑھ کر پہاڑی نالے کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جو بلندی سے بہتا ہوا گرگراتا اور گونجتا ایک قیامت برپا کر دیتا ہے لیکن جس میں پتھر زیادہ ہوتے ہیں اور پانی کم۔ جوش کی اکثر انقلابی نظموں کا یہی رنگ ہے۔ الفاظ کا جوش و خروش۔ ان کی گونج و پکار اور ایک سیلاب کی طرح ان کا ندرول سے بہتے آنا آدمی کو پہلے لمحہ میں تو اپنی طرف ضرور متوجہ کر لیتا ہے۔ لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے۔ تو معانی کی بے مائگی اور مطالب کی سطحیت صاف عیاں ہو جاتی ہے جوش سب کچھ ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ "شاعر انقلاب" ہرگز نہیں۔

جوش کو شاعر بغاوت کہنا زیادہ صحیح ہے۔ اور بغاوت اور انقلاب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بے شک انقلابی اور باغی دونوں رائج الوقت قانون توڑتے ہیں لیکن انقلابی اس لئے قانون توڑتا ہے کہ ایک نیا قانون بنائے وہ جماعت کے خیال سے اور صرف اسی کے تقاضے سے مجبور ہو کر قانون شکنی کرتا ہے لیکن ساتھ ہی نئی جماعت کے احکام کو ایک قانون کی حیثیت دے دیتا ہے۔ اور اسی کی اطاعت کرنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس باغی جماعت کے کسی قانون کو ذاتی مصلحت یا اپنے آرام کی راہ میں حائل پا کر اس سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ایک قانون کو توڑتا ہے لیکن اسے توڑ کر کسی دوسرے قانون کی اطاعت ضروری نہیں سمجھتا۔ جوش باغی شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک طرف مذہب کا مذاق اڑاتے ہیں اور دوسری طرف رسول اللہؐ

کی شان میں نعتیں کہتے ہیں۔ اخلاق و روایات کا سرے سے انکار کرتے ہیں لیکن امام حسین کے مرثیے لکھنے میں انہیں باک نہیں۔ یہ تذبذب اور گو مگو کی کیفیت ایک باغی کی ہوسکتی ہے۔ انقلابی کی زندگی دو رُخی نہیں ہوتی وہ مسلمان ہوتا ہے تو حضرت ابراہیم کی طرح حنیف اور کافر ہوتا ہے تو لینن کی طرح پورا کافر۔

جوش سے ایک شکایت اور ہے وہ اکثر ایسے مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں جن کو وہ خود سمجھتے نہیں۔ مثلاً الہیات سے انہیں دور کا واسطہ بھی نہیں۔ لیکن وہ بے محابا جوش میں آتا ہے اس کے متعلق واہی تباہی کہہ جاتے ہیں یہی حال ان کا فلسفہ میں ہے فلسفہ ایک بڑا ادق موضوع ہے اور اس کے پیچ و خم کا احاطہ کرنا جوش جیسے لاابالی، بے فکرے اور ہیجانی طبیعت والے آدمی کا کام نہیں لیکن تعجب یہ ہے کہ وہ اپنے اشعار میں فلسفیانہ خیالات باندھنے کی کوشش فرماتے ہیں اور اگر لوگ ان کی اس فلسفیت سے مرعوب نہ ہوں اور اقبال کے مقابلہ میں ان کو نہ مانیں تو وہ بگڑ جاتے ہیں اور کبھی یہ کہہ کر "کاش میں پنجاب میں پیدا ہوا ہوتا!" یا "مباش منکر غالب کہ درزمانہ تست" کے مصرعہ سے اپنے دل کو تسکین دے لیتے ہیں۔

اصل قصہ یہ ہے کہ جوش میں "ہمہ گیریت" فطری نہیں ہے ان کی شاعری کا صرف ایک میدان ہے لیکن معلوم نہیں وہ کیوں شعر کی جملہ کائنات میں صاحبقرانی چاہتے ہیں جوش رند شاہد باز ہیں وہ پیتے ہیں اور کھلے بندوں پیتے ہیں اور یہی ان کا اپنا ذاتی رنگ ہے اور اس میں نمائش یار یا کی ادنیٰ سطحی جھلک بھی نہیں چنانچہ ان کی شاعری کی یہ صنف ان کے فن کا اصلی جوہر ہے۔ ان کی رندانہ شاعری میں خلوص ہے۔ شدت تاثر بھی موجود ہے۔ اس میں بے ساختگی ہے۔ روانی ہے، الفاظ بھی سلیس ہوتے ہیں اور زبان

بھی موزوں ۔ لیکن جب وہ اپنے اس مسلک اصلی سے ہٹ جاتے ہیں تو پھر وہ اس قسم کے مہمل شعر کہتے ہیں :۔

تبلیغ کی دھن میں ہے رسالت حیراں — تخلیق میں مصروف ہے شاعر کی زباں
تبلیغ ہے سنت رسولانِ سلف — تخلیق ہے سنت خدائے دو جہاں

یا پھر وہ اس قسم کے بے سرو پا خیالات کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

دے بادہ کہ ہو عقل معطل ساقی — اک شے بھی یہاں نہیں مکمل ساقی
تفصیل کی مملکت میں دل تنگ ہے میں — اجمال کی سلطنت میں لے چل ساقی

یا پھر ایسے مضامین میں ان کو بات کہنے کے لئے موزوں الفاظ نہیں ملتے مولنا محمد علی مرحوم کی وفات پر لکھتے ہیں ۔

اے متاع بردۂ ہندوستان وایشیا — اے کہ تھا ناخن پہ تیرے عقدہ حق کا مدار
عش تھا کاوش پر تری اندازہ صبح و مسا — خم بھی قدموں پر ترے نیرنگیٔ لیل و نہار
اے غرور ملک و ملت! تو وہاں لیتا تھا سانس — موت جس منزل پہ بنتی ہے حیاتِ پائدار

اسی طرح کے ہزاروں اشعار ہیں جہاں طائر خیال شاعر کے ہاتھ نہیں آیا تو اس نے الفاظ سے انتقام لینے کی کوشش کی ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود اس زمانے میں جوش اردو کے بڑے ہردلعزیز شاعر ہیں ان کا کلام لوگ شوق سے پڑھتے ہیں۔ وہ کسی مشاعرہ پر تشریف لاتے ہیں تو شعر کے رسیا ان پر پروانہ وار نثار ہوتے ہیں۔ ان کے کلام کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں یہ سب سچ ہے لیکن اس ہردلعزیزی کے یہ معنی نہیں کہ جوش کا کلام ہر صنف میں قابل تعریف ہے۔ عام طور پر ستائش انبوہ کا مدار کسی چیز کے اچھے ہونے پر نہیں ہوتا۔ ہمارا زمانہ نعروں

اور جے کاروں (SLO GANS) کا ہے۔ "پاکستان زندہ باد" کہئے تو مسلمان آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ "مہاتما گاندھی کی جے" پکاریئے! تو کانگرس والے آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں گے۔ "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ لگایئے تو نوجوان آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے جوش کی شاعری جے کاروں کی شاعری ہے۔ اور آج کل اس کا مقبول ہونا قدرتی بات ہے۔

جوش کی ہر دلعزیزی کی دوسری وجہ ان کا فلسفہ لذتیت ہے۔ آج کل مذہب کی بندشوں اور اخلاقی قوانین کی قیود نے نوجوانوں کے لئے ان کی زندگی بے کیف کر رکھی ہے وہ رُکے ہوئے پانی کی طرح کہیں نکلنے کی راہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ شوق ہوس جذبات اور خواہشات کی دنیا میں پوری کامرانی چاہتے ہیں۔ ایسی کامرانی جس کی عنان کسی کے ہاتھ میں نہ ہو۔ دل کی ہر ہوس پوری ہو۔ دماغ کا ہر خیال منظر علم پر آئے۔ فرد کا جو جی چاہے کرے۔ زندگی عبارت ہو لذت سے۔ اور لذت بھی انسان کے جذبات سفلی کی۔ یہ پیغام اس زمانے کے لئے بڑا دلکش ہے۔ اور جوش اسی پیغام کے علمبردار ہیں۔ ملاحظہ ہو

آفریں بادہ برایں ہمت کونین شکار ۔۔۔ نہ تو شکوے ہی سے واقف نہ شکایت سے دوچار
نشۂ عہدِ جوانی کا ہے ہر چند اُتار ۔۔۔ اس پہ قرنوں کا ہے شانوں پہ اٹھائے ہوئے بار

ایک نظم "حی علیٰ خیر العمل" میں فرماتے ہیں۔

آ ہم نشیں نمازِ صبوحی ادا کریں ۔۔۔ خوشبوئے عود میں درِ میخانہ وا کریں
ہاں اُٹھ کہ جبرِ شیشۂ گل رنگ توڑ کر ۔۔۔ انسانیت کو دامِ خرد سے رہا کریں
باقی جو بچ رہا ہے کچھ ایمان خیر سے ۔۔۔ اس کو بھی آج پائے صنم پر فدا کریں
پودے مچل رہے ہیں گھٹائیں ہیں گرمِ خروش ۔۔۔ آ! ہم بھی آج حقِ جوانی ادا کریں

نماز صبوحی اور میخانہ کا وا ہونا" خرد سے رہائی اور ایمان کو پائے صنم پر فدا کرنا، اور پر خروش گھٹاؤں میں حق جوانی ادا کرنا" یہ جوش کے موضوع اصلی ہیں۔ اور آج کی نئی پود یہی باتیں سننے کو ترستی ہے۔ ظاہر ہے ان کے لئے اس سے بہتر "خیر العمل" کیا ہو سکتا ہے۔ اور جوش صاحب اس "اذان عشرت" کے بہترین مؤذن ہیں

جوش صاحب اپنی "نماز صبوحی" کا یوں ذکر کرتے ہیں :۔

وفا شعار ہوں ترک وفا نہیں کرتا ۔۔۔ کبھی نماز صبوحی قضا نہیں کرتا
سوائے بادہ دیرینہ و بُتِ نوخیز ۔۔۔ خُدا سے اور کوئی میں دعا نہیں کرتا
جو نامراد کو کرتا نہیں گناہ کوئی ۔۔۔ وہ حق حضرتِ آدمؑ ادا نہیں کرتا
ھزار بار کیا عہد ترک صہبا کا ۔۔۔ مگر تبسم ساقی خطا نہیں کرتا

اس قسم کے اشعار میں روانی ہے۔ پیرایہ بیان بھی واضح ہے۔ شاعر کے دوسرے اشعار کی طرح لمبی لمبی بے ہنگم ترکیبیں معانی سے گلوگیر نہیں گو بات رندی کی ہے لیکن بڑے زہدوار انداز میں کہی ہے معلوم ہوتا ہے شاعر نے کیفیتیں بڑے جوش وخروش سے محسوس کی ہیں۔ چنانچہ جوش صاحب کے ان اشعار میں شدتِ تاثر بھی ہے اور خلوص بھی۔

"بیتے ہوئے دن" ایک نظم ہے۔ جس کے آخری دو بند ہیں :۔

غفلتِ نیند میں مستی تھی ۔۔۔ آنکھیں کیا پیمانے تھے
ہر روز جوانی بجتی تھی ۔۔۔ ہر شام دسحر بھیانے تھے
ہر غار میں اک بُتخانہ تھا ۔۔۔ ہر پھول میں سو میخانے تھے
کالی کالی زُلفیں تھیں ۔۔۔ گورے گورے شانے تھے

ان بیتے دنوں کی بات ہے، یہ
جب دل کی بستی بستی تھی

گورے گورے شانے تھے ہلکی پھلکی بانہیں تھیں
ہر گام پہ خلوت خانے تھے ہر موڑ پہ عشرت گاہیں تھیں
طغیانِ خوشی کے آنسو تھے تکمیل طلب کی آہیں تھیں
عشوے، چہلیں، غمزے تھے پیتیو خوشیاں چاہیں تھیں

ان بیتے دنوں کی بات ہے یہ
جب دل کی بستی بستی تھی

یہ جوش کا خاص موضوع ہے۔ اور اسی میں ان کے انہماک نے انہیں "شاعرِ شباب" یا یوں کہہ لیجئے شاعرِ انقلاب بنا دیا ہے۔

شباب کے جذب و کیف اور مستی و بے خودی کو حضرت جوش نے بار بار اپنے کلام میں پیش کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کے شباب کے یہ مرقعے اردو شاعری میں اپنی مثال نہیں رکھتے ہیں ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

رگ و پے میں ہے فلطان نوجوانی ہر اک لمحہ ہے عمرِ جاودانی
مری مٹھی میں ہے روحِ ماہ و سال تپاں ہے ماضی و مستقبل و حال
ترانے وقت سے آزاد ہو کر جھوٹے ہیں ساز کے پردوں سے باہر
گھٹا سی اک سنہری آ رہی ہے پھریری پر پھریری آ رہی ہے
ہواؤں میں ہیں شاہانہ ترانے اُبلتے ہیں گلابی سے خزانے
لہو کی آگ سے دہکے ہوئے ہیں فضا میں پھول سے مہکے ہوئے ہیں
کہیں ظلمت کہیں انوارِ مہتاب خدا معلوم بیداری ہے یا خواب
یہ کیسی طرفگی ہے آج ساقی صراحی میں ہے نور و جبہ باقی

اٹھا ساغر کہ پھر آواز آئی
کہ ہستی پہ اتر ز ہدیائی

جگر مرادآبادی

انتہا محبت۔ سرمستی و وارفتگی، حسن سے دیوانگی کی حد تک شیفتگی اور اس پرخلوص و سوز کی تپش اور محبت کی راہ میں اپنے آپ سے گزر جانے کا حوصلہ۔ یہ عناصر ہیں جگر کی شخصیت کے اور ہماری خوش نصیبی ہے کہ طبیعت کی ان کیفیات کو جن میں اپنے آپ کو سنبھالنا بہت مشکل ہوتا ہے جگر اردو شاعری کے رسیلے بولوں میں بڑی خوبی سے ادا کر سکے حسن کی لَو سے پروانہ جل بھن کر خاک سیاہ ہو جاتا ہے اور اکثر حسن پرست بے تاب طبیعتوں کا بھی یہی حشر ہوتا ہے۔ لیکن ایسے بہت کم ہوتے ہیں کہ حسن کی دنیا میں کھو کر اپنے آپ کو پالیں اور ان کا خرمن ہستی اس آگ میں جل کر طور کا درجہ حاصل کرے۔ یہ حضرت اصغر کے فیض نظر کا اعجاز تھا کہ اپنی طبیعت کی تمام بے قراریوں اور عشق کی آشفتہ سریوں کے باوجود جگر زندگی سے بالکل مایوس نہ ہوئے۔ اور غم عشق یا غم روزگار کو بھلانے کے لئے انہیں اپنے ہوش و خرد کو سرے سے جواب دینے کی ضرورت نہ پڑی ورنہ کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اپنی رفتار طبیعت سے مجبور ہو کر اضطراب مسلسل کا علاج مرگ ناگہاں میں ڈھونڈتے ۵

نگاہِ حضرت اصغر کی ہر ودیعتِ خاص   قرار بن کے جگر کے دلِ حزیں میں رہی

جگر کو خود فطرت سے کچھ کم آشفتگی و دیوانگی نہ ملی تھی لیکن اس میں تھوڑی بہت جو کمی تھی، زمانے نے اس کو پورا کرنے کی بھی اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، ان کی پہلی شادی معاشقہ کا نتیجہ تھی، چند ہی سال بعد اُن کی محبوب نے داغِ مفارقت دیا۔ اس کے بعد ان کا گھر بسا تو، لیکن وہ جلد ہی پھر اجڑ گیا۔ جگر ایسا حساس آدمی اور محبت اور خلوص جس کی زندگی ہو وہ اس طرح آتشِ فراق میں جلے اور زمانے کے ہاتھوں سرگرداں ہو۔ بقول حضرت جگر کے ایک عزیز اور قریبی دوست کے "اتفاق سے حضرت اصغر کی صحبت میسر آ گئی"۔ آپ نے حضرت مولینا سید قاضی عبدالغنی شاہ صاحب منگلوری سے روحانی واسطہ پیدا کر دیا۔ اس سے طبیعت کو سکون ہوا۔ اور خیالات میں ایک زبردست انقلاب ہو گیا جس پر حضرت اصغر کی صحبت سے برابر جلا ہوتی رہی۔۔۔ خاندان کی تباہی بسے گھر کا دیکھتے دیکھتے اجڑ جانا، محبوب ترین ہستیوں کا داغِ مفارقت، مصائب کے پے درپے حملے، خانماں اور بے نیاز جگر کو سونے سے کندن بناتے رہے اس لئے یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ اگر جگر شاعر نہ ہوتے تو زینتِ صحرا ہوتے یا پھر موت کی آغوش میں۔"

عشق و محبت کی یہ فیض بخشیاں اور جگر کی طبیعت کا خلوص اُن کی شاعری کی جان ہے وہ جس حال میں ہوں پورے خلوص و سچائی سے اُس حال کی کیفیات کو جتنی گرمیٔ تخئیل، جوش اور ترنم فطرت کی طرف سے انہیں عطا ہوا ہے اس کے مطابق بیان کرتے ہیں، بزمِ وصل کی سرمستیاں، رندی میگساری کی جرأتیں، ساقی ماہ وش کے ہوش ربا جلوے، حسن کی بے حجابیاں، شوق کی دراز دستیاں، الغرض خلوتِ خاص کے معاملات ہوں یا نہاں خانۂ دل کے واردات، جگر ان کو بھرپور جذبات اور پرجوش و خروش سے بے جھجک پیش کرتے ہیں وہ خود ان کیفیتوں میں اس طرح ڈوب جاتے ہیں کہ اُن کا مادی وجود سراپا نغمہ و شعر بن جاتا ہے شعر کہتے وقت کیف و سرور اور محویت و سرمستی کا ان کا جو عالم ہوتا ہے وہ تو ہے ہی لیکن جب وہ شعر پڑھتے ہیں تو اس وقت بھی ان کی کیفیت کچھ کم سرمستی کی نہیں ہوتی، حسن و محبت کی داستان، نیاز و شوق کا ذکر اور پھر شیریں انداز

بیان اور اُن کی ترنم ریز دُھن ان کا خود مست ہونا۔ اور دوسروں کو مست کرنا، جگر کی زبان سے ان کے شعر سُننا ایک ایسی لذت ہے جس کی مٹھاس دماغ بھولنا بھی چاہے تو کبھی نہ بھول سکے۔ جب کبھی وہ اپنی پسند کی کوئی غزل سناتے ہیں اور خود اُن کی اپنی طبیعت بھی حاضر ہوتی ہے تو اس وقت اُن پر سننے والوں پر اور پھر گرد و پیش کی فضا پر سکر و سرمستی کی کچھ عجب کیفیت چھا جاتی ہے۔

دنیائے مجاز کی ان لذتوں اور کیفیتوں سے محظوظ ہونے اور دوسروں کو ان کے ذکر سے محظوظ کرنے کے بعد جب وہ حقیقت کی حد میں قدم رکھتے ہیں اور محسوسات سے ماوراء کیف وسرور اور حسن وزیبائی کا جو عالم ہے۔ اس کی لذتوں کو الفاظ کے جامے میں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہاں بھی رندِ بلانوش کا خلوص اور عاشقِ صادق کی خود سپردگی عقیدت و معرفت کے مضامین میں وہی تازگی و سرمستی پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ اگر ان کی رندی اور جنون و شوق کے تذکرے دلوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں تو اسی طرح ان کے تعینات کی دُنیا سے "ما ورا" کے تجربات بھی ہمیں کچھ کم لذت نہیں دیتے۔ یہ سب ان کے محبت بھرے دل اور خلوص کا دین ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جگر دورِ حاضر میں اردو شاعروں میں اقبال کے بعد سب سے زیادہ مقبول ہیں اور ہر طبقہ ان کی شاعری سے محظوظ ہوتا ہے۔

مگر گوشت و پوست کی اس دنیا کی لذتوں سے سرشار ہونے کے بعد محسوسات سے پرے کے عالم کی کیفیات سے بہرہ ور ہونے کی کوشش کرتے ہیں وہ محرومئ عشق کا مداوا عشقِ حقیقی سے نہیں کرتے، بلکہ جب ان کی طبیعت اس عالم کی لذتوں سے پوری سیراب ہو چکتی ہے اور پھر بھی ان کی تشنگی نہیں بجھتی تو قدرتاً وہ اُس دنیا کی تلاش میں نکلتے ہیں جس کا حسن لامحدود اور جس کی بہار لازوال ہے جگر ان کم حوصلہ لوگوں میں سے نہیں جو افسردہ انگور کو پینے کی اپنے اندر ہمت اور جرأت نہ پاکر کوثر و سلسبیل

کی تمنا میں زندگی کے دن گنتے رہتے ہیں، اور اس دنیا کے معشوقانِ شوخ و شنگ کے مقابلہ میں اپنی بے بضاعتی کے ڈر سے اُس دنیا کے حسنِ خیالی سے عشق کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جگر نے پی اور اتنی پی کہ کوئی کیا پیے گا؟ "جہانِ عشق میں آوارگی نہ پوچھ میری" کے بعد اس عالمِ محسوسات کی لذتوں کو اپنے شوقِ بے حد اور طلبِ بے نہایت کے لئے ناکافی اور ناتسلی بخش پا کر حسنِ لامحدود کی بے کنار پہنائیوں میں اپنا مقام ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کام و دہن، اور دل و نظر کے ان تجربات کی وجہ سے ہی جگر کی شاعری "قال کی بجائے سرتا پا حال" بن گئی ہے۔ چنانچہ اس میں زندگی کی تازگی ہے حرارت ہے جرأت و حوصلہ ہے۔ کہیں کاوٹ اور اٹکاؤ نہیں۔ کیفیات اور واردات کا پورا بہاؤ ہے جو کچھ کہتے ہیں ان کی اپنی محسوس کی ہوئی اور خود اپنے اوپر بیتی ہوئی بات ہوتی ہے۔ وہ سچے رند ہیں اور سچے صاحبِ دل صوفی بھی۔ صوفی ان معنوں میں کہ رندی و ہوس ناکی ان کے شوق کے حوصلوں کو اپنے تک محدود نہ رکھ سکی۔ اور وہ مجبور ہو گئے کہ آب و گل کی ان لذتوں سے کوئی اور اعلیٰ لذت اور مسرت کی ٹوہ لگائیں تصوف دراصل اسی ماورائیت کی تلاش کا نام ہے اور کوئی شاعر یا آرٹسٹ اس چار سو کے اندر بند رہنا پسند نہیں کرتا۔ شاعر اور آرٹسٹ کا تخیل لامحدود وسعتیں چاہتا ہے۔ اور اس لئے ہر بڑا شاعر اور آرٹسٹ ایک حد تک صوفی ہوتا ہے۔ جگر کے اشعار میں کہیں کہیں جو تصوف کا رنگ جھلکتا ہے۔ تو وہ شاعر کی اسی ماورائیت پسند طبیعت کا نتیجہ ہے۔

جگر نے "فانی مرحوم" پر لکھتے ہوئے شاعر کے صحیح مقام کے بارے میں اپنا نظریہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے فرماتے ہیں: "میرے خیال میں شاعر کا صحیح مقام صرف جمال ہے اور "جمال غیر محدود"۔ جمال اگر پاکیزہ نہیں ہے تو جمال ہی ناقص ہے۔ اس لئے شاعر کی تعریف صرف یہ ہوئی کہ شاعر تنہا اپنی زندگی اور اس کے تمام تر اثرات

کو محبت و جمال کے ماتحت تا امکانِ اجمال و کنایہ کے ساتھ شعری لباس پہنا سکے"۔

شاعر بقول حضرتِ جگر" جمالِ غیر محدود" کا ترجمان ہے اور ظاہر ہے۔ "جمالِ غیر محدود" زمان و مکان اور ملک اور وطن کی حدود سے بالا تر اور "ماوراء" ہے۔ اس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے۔ کہ شاعر اقبال کے الفاظ میں صرف "آفاقی" ہو اور وہ اپنے مخصوص ماحول اور اس کی ضرورتوں سے کوئی سروکار نہ رکھے۔ اس بارے میں جگر کا کہنا یہ ہے کہ بے شک" شاعر کا تعلق محض ایک قوم یا ایک مُلک سے نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ اس کے مزاج و استعداد کو براہِ راست کائنات اور ماورائے کائنات سے مناسبت ضروری ہے۔ کائنات میں خود اس کا ملک اور اس کی قوم آجاتی ہے۔ اس لئے جہاں تک جدوجہد اور خشک زندگی کا تعلق ہے شاعر اپنے تاثرات قوم و ملک کے متعلق صرف تو کر سکتا ہے۔ لیکن ان کی شکل وقتی اور محض تاثراتی ہونی چاہیے۔ نہ کہ دائمی اور تبلیغی"۔

اپنے ماحول اور گرد و پیش کے اجتماعی حالات کا انکار نہ کوئی کر سکتا ہے اور نہ ایسا کرنا کسی کے بس کی بات ہے۔ ہر فرد خواہ وہ بڑے سے بڑا شاعر ہی کیوں نہ ہو اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ لیکن بس زمان و مکان کے حدود میں گھر کر رہ جانا اور ان زمان و مکان کی پہنائیوں کو چیر کر "جمال لامحدود" یا ماورائے تعینات کے عالم میں پہنچ جانا۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ پہلا مقام ایک محدود دل و دماغ والے آدمی کا ہے اور دوسرا مقام حقیقی شاعر اور سچا آرٹسٹ فائز ہوتا ہے۔ جناب جگر کے پیش نظر دوسرا مقام ہے۔ اور وہ اپنی شاعری میں اس مقام کی کیفیتوں کو پیش کرنے کی کوشش کرتے آئے ہیں۔ ہمارے خیال میں شاعری کا یہ نصب العین ان کو حضرت اصغر کی صحبت سے نصیب ہوا۔

ترے ہر نفس میں ہزار آندھیاں ہیں　　　　انہی آندھیوں کو اُٹھاتا چلا جا

محبت کے دریا کا طوفان بن کر
خس و خار کو بھی بہاتا چلا جا

سرِ طور تجلی تھی جو چند ساعت
دلوں پر وہ بجلی گراتا چلا جا

قدم رک نہ جائیں جو حائل ہوں پردے
ہٹاتا، اٹھاتا، جلاتا، چلا جا

محبت محبت محبت محبت
کوئی دھن ہو یہ گیت گاتا چلا جا

ابھی کوئی منزل نہیں تیری منزل
ابھی پائے ہمت بڑھاتا چلا جا

کہاں کے مناظر۔ کہاں کے مظاہر
تو خود اپنے نزدیک آتا چلا جا

قیودِ دو عالم سے آزاد ہو کر
حدودِ محبت بڑھاتا چلا جا

زمانے کے ہمدوش و ہمراہ کب تک
زمانے کو پیچھے ہٹاتا چلا جا

یہ سب کہہ کے در پردہ رازِ حقیقت
جگر یوں نہ دامن بچاتا چلا جا

حدودِ محبت کو قیودِ دو عالم سے آزاد کرنا اور ہر طرف محبت ہی محبت دیکھنا، جگر کے دلِ وسعت ناپیدا کنار کی تمنا ہے۔ اس طرح وہ حسن کو بھی لامعین دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کو دوست میں صرف "حسنِ دوست" کی تلاش ہے وہ حسن جو ہر کہیں ہے لازوال ہے اور ہر حسین شئے اس جلوے کا مظہر ہے۔

پیش نظر ہے حسنِ دوست، حسن کے ماسوا نہیں
عشق میں مبتلا ہوں میں شرک میں مبتلا نہیں

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں میرا حق ہے فصلِ بہار پر

میں قطرہ ہوں لیکن بہ آغوشِ دریا
ازل سے ابد تک بہا جا رہا ہوں

مبارک مبارک میری یہ فضائیں
دو عالم پہ چھایا چلا جا رہا ہوں

وہی حسن جس کے ہیں یہ سب مظاہر
اسی حسن میں حل ہوا جا رہا ہوں

نہ جانے کہاں سے نہ جانے کدھر کو ــــ بس اک اپنی دُھن میں اُڑا جا رہا ہوں
نہ ادراک ہستی نہ احساسِ مستی ــــ جدھر چل پڑا ہوں چلا جا رہا ہوں

نہ صورت، نہ معنی، نہ پیدا نہ پنہاں
یہ کس حُسن میں گم ہُوا جا رہا ہوں

حُسنِ مطلق سے جگر کی شیفتگی تو اپنی جگہ مسلّم سہی، لیکن جب وہ اس حسن مطلق کو ایک خاص ذات میں مرکوز کرتے ہیں اور وہ ذات اُن کے کاروبارِ محبت کا موضوع بنتی ہے۔ تو اس وقت جگر کی شاعری اپنی پوری بہار پر ہوتی ہے۔ اس عالم میں ان کے عشق کی وسعتوں اور حسن کی عظمتوں کا کچھ نہ پوچھیے۔ اپنے محبوب کا وصال، اس کا الم فراق، اس کا انتظار اور اس کا تصور یہ سب کیفیتیں جگر کو اس طرح بے خود اور وارفتہ بنا دیتی ہیں اور وہ اس عالم میں نشاط و سرمستی اور سوز و غم میں مستغرق ہو کر اتنے دل نشین اور شوق و مسرت میں ڈوبے ہوئے شعر کہتے ہیں کہ ہر شخص کو ماننا پڑتا ہے کہ یہی ان کا حاصل شاعری ہے جگر کی شاعری کا کمال واقعہ یہ ہے۔ کہ اسی محبوب ہی کی ذات کا فیضان ہے۔

میرا کمالِ شعر بس اتنا ہے اے جگر
وہ مجھ پہ چھا گئے میں زمانے پہ چھا گیا

حسنِ محبوب کا شکوہ ملاحظہ ہو؛

حسن کی معیت میں اس طرح شباب آیا ــــ جیسے کچی نیند اُٹھ کر کوئی مستِ خواب آیا
حشر در جلو آیا لشکر در رکاب آیا ــــ حسن کی کھلی آنکھیں، عشق کا شباب آیا
گودیوں میں عصمت کی کھیلتا شباب آیا ــــ شوخیوں کے جھرمٹ میں شاہدِ حجاب آیا
زمزمہ نغمہ بکھیرا ہے دل سب کھینچ کر گلشن میں ــــ ہر گلِ فسردہ پر اک نیا شباب آیا

وہ جھکی جھکی پلکیں، وہ عرق عرق عارض — شکوۂ ستم کرکے خود مجھے حجاب آیا
دھیان تیرا کیا آیا، جانِ صد بہار آئی — یاد تیری کیا آئی، حاصلِ شراب آیا

جگرؔ جب داستانِ فراق بھی رقم فرماتے ہیں تو اس میں تلخی کی بجائے رنگینی اور لذت کا عنصر غالب ہوتا ہے وصال اور پھر اس کے بعد فراقِ جاناں کا ایک مرقع دیکھیئے ۔

تڑپ کر دل انہیں تڑپا رہا ہے — قیامت پر قیامت ڈھا رہا ہے
عجب عالم سا دل پر چھا رہا ہے — حسیں جیسے کوئی شرما رہا ہے
یہ کیسا دل پر عالم چھا رہا ہے — کہ تجھ سے مل کے بھی گھبرا رہا ہے
وہ زلفیں دوش پر بکھری ہوئی ہیں — جہانِ آرزو تھرّا رہا ہے

الغرض جگرؔ وصال کا فسانۂ شوق کہیں یا فراق کی داستانِ غم بیان کریں، اس کوشش کر بے اختیار ہر شخص کو حال آجاتا ہے۔ محبوب کے تصور کی تصویر کھینچنے میں جگرؔ کی گلکاریاں ملاحظہ ہوں ۔

یادش بخیر جب وہ تصور میں آ گیا — شعر و شباب و حسن کا دریا بہا گیا

اس شعر و شباب و حسن کی مزید تفصیل ایک دوسری غزل میں یوں کرتے ہیں ۔

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں — یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں
وہی قیامت ہے، قدِ بالا وہی ہے صورت، وہی سراپا — لبوں کو جنبش، نگہ کو لرزش کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں
تمام رعنائیوں کے مظہر، تمام رنگینیوں کے منظر — سنبھل سنبھل کر، سمٹ سمٹ کر، سب ایک مرکز پہ آ رہے ہیں
فضا میں نشہ برس رہا ہے دماغ پھولوں میں بس رہے ہیں — وہ کون ہے جو برس رہا ہے؟ سبھی کو میکش بنا رہے ہیں
زمین نشہ، زمان نشہ، جہان نشہ مکان نشہ — مکاں کیا؟ لامکاں نشہ، ڈبو رہے ہیں بہا رہے ہیں

ایک غزل ہے جس کا عنوان ہے "میرے لئے" اس کا مقطع ہے ۔

اُف وہ کتنا اس کا پیارا ہوں میں ہر طرح اے اثر — میں جگرؔ کے واسطے ہوں اور جگر میرے لئے

اس کیفیت سے سرشار ہو کر جگرؔ نے اتنے پُر اثر اور جوش و مسرت میں بھرے ہوئے شعر کہے ہیں کہ ایک ناقد کو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حضرت جگرؔ کی شاعری کی شاید یہی معراج ہے ۔

حفیظ جالندھری

کئی سال کی بات ہے کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک مشاعرہ تھا۔ صدرِ مشاعرہ سر فیروز خاں نون تھے۔ طلبہ کا اتنا بڑا جمگھٹا اور معاملہ شعر و شاعری کا، "داد و تحسین" کے نام سے "سخن سنج" طلبہ سے جو کچھ بھی بن آتا تھا کر رہے تھے۔ کوئی شامت کا مارا شاعر اپنا کلام سُنانے مسند پر آجاتا تو پھر اس کی خیر نہ تھی، بزمِ مشاعرہ کیا تھی ایک معرکہ کارزار گرم تھا اور تیر و تفنگ کی بجائے فقرے اور پھبتیاں چل رہی تھیں۔ شور و غل کے مارے کان پھٹے جاتے تھے۔ محفل کا یہ رنگ تھا کہ ایک صاحب منحنی اور کمزور سے مسند پر تشریف لائے۔ ہال میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ داد دینے والوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ ایک دو بار کھانسا گلا صاف کیا۔ اور خاص لَے میں اپنا کلام پڑھنا شروع کیا۔ ایک آدھ شعر پڑھا تھا کہ ایک کونے سے کسی نے کوئی فقرہ کہا۔ یہاں اس کا برجستہ جواب موجود تھا۔ اب میدان صاف تھا۔ ہال پر سکوت طاری تھا۔ اور سب لوگ سنبھل کر بیٹھ گئے تھے۔ معلوم ہوتا

کہ ابو الاثر حفیظ جالندھری ہیں۔ حفیظ صاحب اپنا کلام سنا رہے تھے یا یوں کہئے کہ وہ اپنا کلام گا رہے تھے۔ کلام کی خوبی سمجھئے یا اُن کی آواز کا کمال کہ حاضرین دم بخود ہو گئے۔ حفیظ بلند آواز سے اپنا کلام پڑھ رہے تھے۔ اور آواز تھی کہ کانوں کے راستہ دلوں کو بے خود اور سرمست بنا رہی تھی۔ ساری محفل جھوم رہی تھی۔ اور سب پر ایک نشہ سا چھایا ہوا تھا۔ آواز میں رس تھا۔ اور صرف رس نہیں وقار اور رعب بھی تھا۔ ایک حُسن دلوں کو لبھاتا ہے۔ انہیں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس لئے کہ اسے چاہنے والے چاہیں۔ ایک حُسن دلوں کو موہ لیتا ہے۔ ان کو اپنا شیفتہ کرتا ہے تاکہ ان پر حکومت کرے۔ اور ان کو اپنی بارگاہ پر سرنگوں کرے۔ حفیظ کی رسیلی آواز صرف لُبھا نہ رہی تھی۔ اس کا پُر وقار اور بارُعب نغمہ دلوں اور دماغوں پر اپنا اقتدار جما رہا تھا۔ ساحری اور جادوگری میں آواز کی تاثیر کتنی بڑی ہے۔

حفیظ مغنی نہیں شاعر ہیں۔ قدرت نے انہیں رسا ذہن بھی دیا ہے اور دل موہ لینے والا ترنم بھی۔ ان کی نغمہ پردازی صرف خوش گلوئی کا نتیجہ نہیں۔ اُن کی آواز میں اُن کے دل و جگر کا لہو بھی ہوتا ہے۔ وہ بالقصد گاتے نہیں بلکہ اُن کے شعر انہیں مجبور کرتے ہیں کہ وُہ اُنہیں گا کر پڑھیں۔ ترنم اور نغمہ حفیظ کے لئے ذریعہ ہیں مقصد نہیں۔ حفیظ شاعر ہیں۔ ان کے شاعر ہونے میں کسے شک ہوگا۔ شاعر کا وجُود کئی عناصر سے ترکیب پاتا ہے۔ تخیل، تفکر، شدّت تاثر اور ترنم۔ ہر شاعر میں جو صحیح معنوں میں شاعر ہوگا۔ ان عناصر کا کسی نہ کسی حد میں پایا جانا لازمی ہے لیکن ان عناصر کا کم یا زیادہ ہونا ایک شاعر کو دوسرے سے ممتاز کرتا ہے۔ حفیظ کو قدرت سے جذبات اور ترنم کا سب سے بڑا حصّہ ملا۔ گو تخیل اور تفکر کی بھی اُس کے ہاں کمی نہیں لیکن ان

کی حیثیت ثانوی ہے۔

یہ حفیظ کی طبعی مناسبت کا تقاضا تھا کہ اُس نے گیت لکھے حفیظ کی شخصیت کا پُورا اظہار اُس کے گیتوں میں ہوتا ہے۔گیت ترنم اور جذبات سے مل کر زندگی پاتے ہیں۔

اور حفیظ کی طبیعت میں ترنم اور جذبات کا عنصر سب سے زیادہ ہے۔اُس نے غزلیں بھی لکھی ہیں۔اور اس میں شک نہیں کہ اس کے شاعرانہ جوہر کبھی کبھی غزل میں بھی اپنا کمال دکھا سکے۔لیکن حقیقت میں حفیظ کا اصلی میدان گیت ہی ہیں۔حفیظ نے اور بھی بہت کچھ لکھا لیکن یہ بڑی جرأت ہو گی۔ اگر میں عرض کردوں کہ یہ سب بیشتر آورد ہے۔ حفیظ نے طبیعت پر زور ڈال کر شاعری کی اُن اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ممکن ہے گیت کا میدان بہت محدود ہو اور شاعر وسیع تر فضا کی اپنے لئے ضرورت سمجھتا ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ حفیظ کی یہ شاعری شاید دیرپا نہ ہو اور اس کے گیت زیادہ عمر پائیں۔

مثال کے طور پر حفیظ کے شاہنامہ اسلام ہی کو لیجئے۔ شاعر کی یہ کوشش گو ملی اعتبار سے بڑی تعریف کی مستحق سمجھی جائے لیکن کیا یہ کہنا برمحل نہ ہوگا کہ" شاہنامۂ اسلام" میں شاعری بہت کم ہے اور منظوم نثر زیادہ۔ تاریخ کے واقعات کو ردیف وقافیہ میں قلمبند کر دینا " شاہنامۂ اسلام" کے لئے کافی نہ تھا" فردوسی مرحوم" نے بقول حفیظ ایران کو زندہ کیا۔اور یہ ہے بھی سچ۔ فردوسی کو ایران سے محبت تھی۔ ایران کی سرزمین سے محبت تھی۔ ایران کی پرانی تاریخ سے شیفتگی تھی۔ اور ایران کے بادشاہوں سے عشق تھا۔ شاہ پرستی اور وطن پرستی ایرانیوں کے مذہب میں

داخل ہے۔ حفیظ صاحب نے "شاہنامۂ اسلام" لکھا۔ اوّل تو یہ نام ہی ایک حد تک مہمل ہے۔ اور شاید وجہ یہ ہو کہ شاعر کے ذہن میں اسلام کا صحیح تصور نہیں۔ بہرحال نام کی بحث کو جانے دیجئے۔ سوال یہ ہے کہ "شاہنامہ اسلام" لکھنے میں کونسا جذبہ محرک تھا۔ حفیظ نے گیت لکھے۔ شباب کے نغمے گائے۔ یہ اُن کی دلی کیفیات تھیں جو شعر کے لباس میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہوئیں۔ لیکن "شاہنامہ اسلام" لکھنے سے حفیظ صاحب کو اپنے کس جذبہ کی تسکین منظور تھی؟ آپ کہیں گے حفیظ مسلمان ہے۔ اُس کو اسلام سے محبت ہے۔ اور اسی محبّت کا اظہار "شاہنامہ" کا محرک ہُوا۔ یہ مسلّم لیکن صرف اتنی عرض ہے کہ وہ جذبہ جس نے حفیظ سے گیت لکھوائے، اور یہ جذبہ جو شاہنامہ لکھوانے کا باعث بنا۔ پہلے جذبہ سے بہت کمزور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حفیظ کے شاہنامہ میں وہ بات نہ پیدا ہو سکی۔ جس کی وجہ سے فردوسی ایران کو زندہ کر سکا۔

سعادت حسن منٹو

سعادت حسن صاحب منٹو پرانے لکھنے والے ہیں۔ پرانے اِن معنوں میں کہ وہ بہت زمانے سے لکھ رہے ہیں۔ منٹو اُس زمانے میں بھی لکھتے تھے۔ جب آدمی کو لکھنا نہ چاہیئے یا اگر وہ لکھتے بھی تو بہت کم۔ منٹو طالب علم ہی تھے تو پڑھتے کم تھے اور لکھتے زیادہ۔ سوچتے ضرور لیکن یہ نہ کرتے کہ سوچی ہوئی بات کو دماغ میں لوٹاتے پھراتے۔ اس پر غور کرتے، اس کی اونچ نیچ دیکھتے۔ بس یہ کرتے کہ جوں ہی کوئی بات جی میں آئی اُسے زبانِ قلم سے صفحہ کاغذ پہ لے آتے۔ کسی واقعہ سے متاثر ہوتے تو اس تاثر کو الفاظ میں ادا کرنے کے لئے بے تاب ہو جاتے۔ ضبط اور صبر جو ایک فن کار کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا تاثر اور تخیل۔ سعادت صاحب اس سے بے نیاز رہے۔ اور کبھی کوشش نہ کی کہ اگر ضبط اور صبر طبیعت کا فطری خاصہ نہیں تو کم سے کم تربیت اور ضرورت کے خیال سے اس کی عادت ڈالتے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سعادت حسن صاحب نے بہت لکھا۔ بہت اچھی چیزیں نسبتاً کم لکھیں لیکن طبیعت کی اُفتاد سے یا تلاش معاش کے تقاضے سے مجبور ہو کر معمولی چیزیں بہت لکھ ڈالیں۔ اور اس طرح نئے ادب کا یہ بیش قیمت جوہر ہمارے خیال میں اپنے اصلی کمال کو نہ پہنچ سکا۔

منٹو صاحب کے افسانے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سعادت صاحب کی طبیعت بے حد تاثر پذیر ہے۔ ذرا سا واقعہ اُن کے اندر شورشوں کی ایک دُنیا پیدا کر دیتا ہے۔ مشاہدہ کی قوت اتنی تیز ہے کہ کسی کی کوئی اضطراری حرکت یا یوں ہی کسی کا بلا سوچے سمجھے معمولی سے معمولی بات کرنا مصنّف کے تصورِ خیال کے سامنے انسانی فطرت کے تمام پوشیدہ رازوں کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ چنانچہ منٹو انسانوں کے ان پوشیدہ رازوں کو برملا صاف صاف کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ اور کسی واقعہ کو دیکھ کر جو تاثرات اُن کے ذہن پر وارد ہوتے ہیں وہ بلا خوف انہیں ہمارے سامنے لے آتے ہیں منٹو کے تجربات اور مشاہدات کی دُنیا بڑی وسیع ہے حالات کے نشیب و فراز کو اُس نے خوب دیکھا ہے۔ دوسروں نے کتابوں میں زندگی دیکھی ہے، منٹو نے جو کچھ سیکھا ہے زندگی سے سیکھا ہے۔

منٹو کے افسانے اس زندگی کی زندہ تصویریں ہیں۔ لیکن ان تصویروں میں ادیب کے موقلم کا زیادہ حصہ نہیں۔ منٹو کے فن کا یہی کمال ہے اور یہی نقص بھی۔ کاش یہ حساس دماغ اور بے تاب روح جذبات کی رَو میں یوں نہ بہہ جایا کرتی۔ اس کا رہوارِ قلم ہمیشہ سرپٹ دوڑنے سے کام نہ رکھتا، کبھی تو یہ رُکتا۔ کبھی تو یہ سوچتا کہ کدھر کو جانا ہے۔ دوڑنا، شب و روز دوڑنا، حرکت، دن رات حرکت؛

اور لکھنا اور لکھتے جانا۔ ان کا حاصل کمیت کے اعتبار سے بہت ہوتا ہے۔ لیکن اس حاصل کی نوعیت زیادہ بہتر نہیں ہو پاتی "بادہ نیم رس" اور "شوق نارسا" کو اپنی حقیقی منزل تک پہنچنے میں کئی مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ افسوس منٹو صاحب میں صبر کا یارا نہ تھا۔ اور ضبط کا حوصلہ اُن سے نہ ہو سکا۔ اور یہ افسانہ نگار اپنی حقیقی منزل سے اِدھر ہی رُک کر رہ گیا ہے۔

منٹو کا ایک افسانہ "لالٹین" ہے جس میں ایک کردار یوں گویا ہوتا ہے:۔

"جب مجھے کسی بیتے ہوئے واقعہ کو اس کی تمام شدتوں سمیت محفوظ کرنا ہوتا ہے۔ تو میں قلم اُٹھاتا ہوں۔ اور کسی گوشے میں بیٹھ کر کاغذ پر زندگی کے اس ٹکڑے کی تصویر کھینچ دیتا ہوں۔ یہ تصویر بھدی ہوتی ہے یا خوبصورت۔ اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ .... میں یہ کہانیاں صرف اس لئے لکھتا ہوں کہ مجھے کچھ لکھنا ہوتا ہے۔ جس طرح عادی شراب خور دن ڈھلے شراب خانہ کا رُخ کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح میری انگلیاں بے اختیار قلم کی طرف بڑھتی ہیں۔ اور میں لکھنا شروع کر دیتا ہوں..... میں ادب سے دُور زندگی سے نزدیک تر ہوں۔ زندگی۔ زندگی۔ آہ زندگی"

آگے چل کر یہی کردار کہتا ہے:۔

"...... بعض اوقات مجھے اپنا یہ فعل بہت بُرا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میں کیا کروں۔ مجبور ہوں۔ میرے پاس اگر زیادہ نہیں ہے۔ تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اگر مجھ میں سفلہ پن پیدا ہو گیا ہے۔ تو اس کا ذمہ دار میں کیسے ہو سکتا ہوں۔ میرے پاس تھوڑا بہت جو کچھ

بھی ہے غنیمت ہے!"

کیا منٹو صاحب اس کردار کی زبان سے غیر شعوری طور پر اپنی کہانی تو نہیں کہہ رہے۔ لیکن اس معاملے میں ہم ایک عرض ضرور کرنا چاہتے ہیں۔ منٹو صاحب میں بڑی صلاحیتیں ہیں وہ اپنی ان صلاحیتوں سے ٹھکانے سے کام نہیں لے رہے۔ اگر وہ اب بھی ذرا ضبط کریں تو اُن کے پاس بہت کچھ ہے۔ اور وہ ادب اُردو میں اس سے کہیں زیادہ اپنے زندہ جاوید نقوش چھوڑ سکتے ہیں۔

اسی افسانے میں وہ لکھتے ہیں:۔

"گو میرا شباب ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکا ہے مگر میں ان دنوں کی یاد پرجی رہا ہوں۔ جب میں جوان تھا مجھے معلوم تھا کہ یہ سہارا بھی کسی دن جواب دے جائیگا۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہوگا میں بتا نہیں سکتا لیکن اپنے موجودہ انتشار کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا انجام چشم فلک کو بھی نمناک کردے گا۔ آہ خرابۂ فکر کا انجام!"

حساس اور تاثیر پذیر ذہن کا یہی انجام اکثر ہوتا ہے۔ لیکن کیا یہ ہونا حتمی ہے اور لابدی ہے۔ اور اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں؟ ہمارے خیال میں ضبط اور احتیاط سے زندگی دوسرا رُخ بھی اختیار کر سکتی ہے۔

بیدی - کرشن - اشک

بیدی کرشن اور اشک پنجاب کے نئے افسانوی ادب کے تین ممتاز رکن ہیں۔ اور یہ تینوں کم وبیش ایک ہی رنگ میں لکھتے ہیں۔ تینوں سماج کے ظاہر و باطن کو اندر اور باہر سے جانچتے، پرکھتے اور کھرچتے ہیں۔ تینوں کے تینوں اپنے گرد و پیش سے اور اپنے ماحول سے ناخوش ہیں اور اس کو بدلنے کے لئے بے تاب نظر آتے ہیں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک فطرتاً اپنے مزاج اور طبیعت کے مطابق اسے بدلنے کی سعی کرتا ہے۔ بیدی تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ سماج کے گورکھ دھندے سے دور بیٹھا؛ اس کے چھلاووں کو کسی تارک الدنیا جوگی کی طرح دیکھ رہا ہے اس کا دل بیدار ہے۔ اور آنکھیں کھلی ہوئیں۔ لیکن وہ ہے سب سے بے تعلق۔ دکھ درد کو دیکھ کر رقت کے مارے اس کی آنکھیں تر نہیں ہوتیں اور نہ طرب اور مسرت میں سرشار ہو کر اس کا جی بے قابو ہوتا ہے۔ وہ سنجیدگی سے سب کچھ دیکھتا ہے بغیر کسی

کا پاس اور خیال کئے۔ زندگی اس کے نزدیک ابر و باد کا طوفان نہیں کہ ہر دم جھکڑ آندھیوں اور رعد و برق کی بھرمار رہے۔ بلکہ اس کی مثال ایک دریا کی سی ہے، جو رواں دواں بہہ رہا ہو۔ یہ دریا بڑا منہ زور سہی اس کے اندر بڑی بڑی بھنوریں سہی لیکن اوپر سے اس کی سطح دیکھئے۔ تو ہموار سی نظر آتی ہے! اور چلتا ہوا سدا آبشاریں نہیں بنایا کرتا۔

زندگی تو سب کے لئے ایک سی ہے۔ لیکن ہر شخص اسے اپنی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ بیدی خود خاموش۔ کم سخن، سنجیدہ اور متین ہے مجمع میں ہو تو تنہا نظر آتا ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے اس طبیعت والے آدمی کے سکون کو دنیا کا پُر شور سے پُر شور ہنگامہ بھی نہیں توڑ سکتا۔ وہ دھیرے دھیرے نہایت اطمینان سے زندگی کے اُتار چڑھاؤ کا تماشہ کرتا ہے۔ اور اپنے تاثرات کو بغیر کسی وقتی جوش کا اثر لئے نہایت ٹھیرے ہوئے انداز میں الفاظ کی شکل میں پیش کر دیتا ہے قدرتاً ایسے صاحب قلم کے مرقعوں میں زندگی اپنے اصلی رنگ میں جلوہ گر ہوگی لیکن ظاہر ہے ان مرقعوں میں وہ گرمی وہ کیفیت اور جذب نہ ہوگا۔ جس کی تاثیر دیکھنے والے کو اپنے آپ سے بے خبر کر کے اس کے دل و دماغ پر اپنا قبضہ کر لیتی ہے۔ وہ فن کار جو اپنے موضوع میں کھو جاتا ہے، جیسے ایک صوفی ذات خداوندی میں اپنی ہستی گم کر دیتا ہے۔ اسی فنِ کار کی تخلیق "جزو لیست از پیغمبری" کی مستحق ہوتی ہے۔ بیدی ہمیشہ زندگی کے کنارے پر کھڑا دیکھتا ہے۔ اور اس کا احساس اور اس کے تاثرات کبھی بھی اس کے شعور پر غالب نہیں آتے۔ وہ اپنے موضوع سے الگ ہٹ کر اس کی چھان بین کرتا ہے۔ اور ظاہر ہے اس طرح کسی غلط بینی یا غلط فہمی کا کوئی امکان

نہیں ہوتا۔ تصویر کشی کا یہ کمال بیدی کے فن کا خاص جوہر ہے۔

کرشن نے جس سماج میں جنم لیا اور وہ اس میں پلا اور بڑا ہوا اس سماج سے اسے نفرت ہے۔ اس کی ایک ایک بات اُسے کھٹکتی ہے۔ وہ اس کے قاعدوں ضابطوں، اس کی نیکیوں اور اس کی بدیوں سے بیزار ہے۔ اس کی نظر میں یہ سب بے کار کی زنجیریں ہیں۔ جو زندگی کی آزادی کو کچل رہی ہیں۔ یہ بے سمجھ اور خود غرض انسانوں کے بنائے ہوئے بندھن ہیں۔ جن کی وجہ سے زندگی کا بہتا ہوا دھارا آکر رُک گیا ہے۔ اور رُکے رُکے اس میں سڑاند پیدا ہو چلی ہے۔ یہ نفرت اور یہ بیزاری کرشن کے لئے کوئی خارجی چیز نہیں رہی۔ بلکہ اس کا باطن زندگی کی ان بدعنوانیوں سے اتنا تپا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ لوہا آگ کی بھٹی میں پڑ کر لوہا ہی رہا یا آگ بن گیا۔

شوق و ولولہ کی بلندی اور حالات کی ناسازگاری ایک حساس اور نرم دل والے نوجوان کو سماج سے آخر باغی بنا دیتی ہے۔ کرشن اپنی ارد گرد کی دنیا کو اس نظر سے دیکھتا ہے اور نہایت صفائی سے بے جھجک جو اس کے دل پر گزرتی ہے اسے لکھ دیتا ہے۔ اس میں لازمی طور پر طنز کا بڑا گہرا رنگ ہو گا۔ کچھ تو ظاہر ہے موضوع کا اپنا رنگ ہوتا ہے اور کچھ کرشن کی داخلی بے چینی اور بے زاری اسے اور چوکھا کر دکھاتی ہے۔ عمیق نفرت اور عمیق محبت رکھنا بڑے آدمی کا کام ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ اس عمیق محبت اور عمیق نفرت میں وسعت ہو عمومیت ہو اور ہمہ گیریت ہو۔ نفرت فی نفسہٖ کوئی بُری چیز نہیں ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ نفرت اور محبت میں دراصل کوئی فرق بھی نہیں ضرورت صرف ہے کہ ان میں عمق ہو۔ اور عمق کے

ساتھ وسعت اور عمومیت ہو۔ ورنہ محدود اور تنگ نفرت یا محبت تو ادیب کی راہ میں سب سے گہری کھائی ہے۔

اشک اس معاملہ میں بیدی اور کرشن دونوں سے اپنی الگ راہ رکھتا ہے۔ اس کے افسانوں، ڈراموں اور ناول میں چھینٹیں ضرور ہیں لیکن بہت ہلکی اور کہیں کہیں۔ اشک نے سماج کو ہر گوشہ اور ہر پہلو سے دیکھا ہے۔ اس کے اپنے تجربات کا دائرہ بھی بہت وسیع اور ہر نوع کا ہے۔ گھروں کی زندگی عزیزوں اور رشتہ داروں کی آپس کی کشمکشیں۔ شادی بیاہ۔ طبیعتوں کا میل اور پھر بگاڑ۔ چاہ اور پھر دُوری۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی عنفوان شباب میں جذباتی ترنگیں۔ محبت کے طوفانی عہد کے بعد آنکھوں کا کھلنا، اشک کے یہ خاص موضوع ہیں۔ اور ان معاملات میں اس کی نظر بڑی گہری اور سوجھ بوجھ والی ہے۔ اس کے پڑھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اشک جگ بیتی نہیں کہہ رہا بلکہ اپنی آپ بیتی سنا رہا ہے۔

اشک کی طبیعت بھی اپنے ان دونوں ہم عصروں سے جُدا ہے۔ بیدی بہت کم بولتا ہے۔ اس کا چہرہ ایک سنجیدہ اور متین آدمی کا ہے۔ کرشن دیکھنے میں زیادہ سنجیدہ نظر نہیں آتے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو اس طرح لئے دئے رہتے ہیں کہ ان پر سنجیدگی کا گمان ضرور ہوتا ہے لیکن اشک بے تھکان بولتے ہیں۔ وہ پہلی ملاقات ہی میں آپ کو سب کچھ کہہ دیں گے۔ طبیعت میں اجنبیت نام کو نہیں۔ سب سے بے تکلف اور سب کے دوست۔ انگریزی میں ایک مثل ہے کہ تحریر کا انداز لکھنے والے کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے بیدی کا اسلوب

کچھ رُکا رُکا۔ الفاظ مشکل سے زبانِ قلم سے نکلتے معلوم ہوتے ہیں۔ کرشن ذرا کھل کر لکھتا ہے۔ لیکن قلم اتنا آزاد نہیں، لیکن اشک بے روک ٹوک لکھے جاتا ہے۔ اس کا تازہ ناول "ستاروں کے کھیل" پڑھیئے۔ ۸۵۲ صفحہ کی کتاب ہے کہیں کوئی ایسا مقام نظر نہیں آتا۔ جہاں مصنف کسی خیال کو سوچنے کے لئے یا کوئی جملہ یا ترکیب دور سے لانے کے لئے رکا ہو۔ شروع سے آخر تک ایک ہی سی روانی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ تینوں کے موضوع باوجود ایک سے ہونے کے پھر بھی ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اشک زیادہ تر واقعات اور تاثرات کو کسی گہرے تجزیئے اور غیر معمولی ادھیڑ بن کے بغیر بیان کرتا جاتا ہے اور ظاہر ہے بیانیہ انداز میں جو روانی ہو سکتی ہے وہ تنقید و تجزیہ میں نہیں ہوتی۔ بیدی افسانے کی تکنیک اور اپنے کرداروں کے نفس تجزیہ کا زیادہ خیال رکھتا ہے وہ عموماً کسی نہ کسی واقعہ پر اپنے افسانے کی عمارت کھڑی کرتا ہے اور اس واقعہ کے ضمن میں وہ انسانی فطرت کا کوئی پوشیدہ راز بے نقاب کر جاتا ہے۔ کرشن چندر مصور ہے، لیکن ایسا مصور جو اپنی دیکھی ہوئی چیزوں کو جوں کا توں کاغذ پر نہیں کھینچ دیتا۔ بلکہ اپنی طرف سے ان تصویروں میں نئے نئے رنگ بھرتا ہے۔ قدرتی مناظر ہوں تو اس کا موئے قلم اسے اتنا دلکش بنا دیتا ہے کہ حسن کی اتنی فراوانی شاید ہی اس صفحۂ دنیا پر مل سکے۔ اور جب وہ انسانوں پر آتا ہے تو اس کا جمالِ آفریں قلم طرب نگاری کرتا کرتا حزن والم اور طنز کی دل ہلا دینے والی داستانیں لکھنے لگتا ہے۔

ن، م، راشد

نئی طرز میں لکھنے والے نوجوان شعراء میں ن۔م۔ راشد بہت بلند حیثیت رکھتے ہیں۔ انکے کلام کا پہلا مجموعہ کچھ سال ہوئے "ماورا" کے نام سے چھپا۔ نئی شاعری کے دلدادوں نے اُسے بہت پسند کیا! اور شاید یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ نوآموز شاعروں پر راشد کے اسلوب بیان اور اسکے طرز فکر کا بڑا اثر بھی پڑا۔ راشد کی شاعری ہمارے ہاں ایک نئے آہنگ اور نئے پیام کی حامل ہے۔ انکے آہنگ پر بعض ارباب نقد کو یہ اعتراض ہے کہ وہ بے سُرا سا ہے! دراس میں وہ ترنم اور نغمہ نہیں جو اردو شاعری کا لازمی عنصر ہے اور جسکے کیف و سرور سے ہمارے کان صدہا سال سے مانوس ہیں۔ انکا کہنا یہ ہے کہ بیشک راشد کی یہ کوشش تو اپنی جگہ قابل تعریف ہے کہ وہ ذہن کے تمام کے تمام شاعرانہ ہیجانات کو مربوط اور مسلسل شکل میں پیش کرتے ہیں۔ اور اس طرح غزل کے انتشار اور اسکی بے ربطی کا ایک حد تک تدارک ضرور ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کا یہ تسلسل اور ربط مضمون اردو شاعری کے حسن و جمال اور ذوق نغمہ کو کھونے کے بعد ملتا ہے! اور ظاہر ہے یہ سودا اردو ادب کے حق میں کافی مہنگا ہے۔ راشد کے پیام کے بارے میں سخن سنج حضرات کا یہ اعتراض ہے کہ وہ اتنا مبہم اور پیچیدہ ہے کہ بڑی جانکاہی کے بعد بھی اس کا اصل مقصود سمجھنا مشکل ہے! اور پھر مزید ستم یہ ہے کہ بقول ان کے بات کچھ اتنی گہری نہیں ہوتی۔ لیکن راشد اُسے اس طرح

کہتے ہیں کہ اس پر خواہ مخواہ فلسفیانہ تفکر کا گمان گزرتا ہے۔

راشد کو خود اس امر کا اعتراف ہے کہ انکی شاعری کی "تکنیک" پہلوں سے جدا ہے اور یہ قدرتاً نئی چیز شروع شروع میں لوگوں کیلئے نامانوس ہوتی ہے لیکن انہوں نے یہ نئی تکنیک کیوں اختیار کی، اس کا جواب خود ان کی زبان سے سنئے۔ "ماورا" کے مقدمہ میں اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں۔

"اردو شاعری میں یہ آزاد شاعری کی تحریک محض ذہنی شعبدہ بازی نہیں محض جدت اور قدیم راہوں سے انحراف کی کوشش نہیں۔ اگر ان نظموں میں آپکو کسی تخلیقی جوہر کی معمولی سی چمک، کسی قوت کا ادنیٰ سا شائبہ، کسی نئے احساس کی ہلکی سی جنبش نہ ملے، تو انہیں قطعی طور پر رد کر دیجئے۔ کیونکہ اجتہاد کا جواز صرف یہ نہیں کہ اس سے کس حد تک قدیم اصولوں کی تخریب عمل میں آئی، بلکہ یہ کہ آیا تعمیری ادب اس میں سے کسی نئی صبح کی طرح نمودار ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر یہ نہ ہو تو اجتہاد بیکار ہے۔ اجتہاد کا جواز صرف خیالات و افکار ہی پیش کرتے ہیں۔ جن کی خاطر نیا راستہ اختیار کیا گیا ہے۔"

راشد صاحب کے نزدیک نئے افکار و خیالات کے آزادانہ اظہار کیلئے ہماری شاعری کا پرانا ڈھچر ایک روک ہے۔ اردو شعر کی پرانی روایات اور قافیہ اور وزن کی قیود ادب کی نئی صبح کو کبھی طلوع ہونے نہیں دینگی۔ اسلئے اجتہاد کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن آخر وہ کونسے افکار و خیالات ہیں، جنکی خاطر راشد شاعری میں نیا راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ "ماورا" کے مقدمہ میں موصوف نے ان کی طرف بھی اشارہ کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

"جدید غیر ملکی تصورات کو چاہے ہم پسند کریں یا نہ کریں، مگر آج انکی گرفت ہمارے خیالات اور عزائم پر ضروری ہے اور اس سے ہمیں قطعاً مفر نہیں۔ کیونکہ تہذیب اور ثقافت جغرافیائی حدود سے نکل کر اب عالمگیر ہوتی جاتی ہے۔"

الغرض ان ہی جدید غیر ملکی تصورات کو پیش کرنے کیلئے اردو میں آزاد شاعری معرض وجود میں آ رہی ہے۔ یہاں ہمیں آزاد شاعری کے اس منصب اور اسکے اجتہاد کے متعلق کچھ نہیں کہنا۔ ہمارے بزرگ اس شاعری کی تکنیک اور اسکے پیام کے متعلق جو کچھ بھی کہیں اور راشد کو اس ضمن میں جتنا بھی چاہیں مطعون کریں لیکن اتنا تو ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ راشد کی شخصیت اور انکے اس اجتہاد میں ایک وزن ہے۔ ایک قوت ہے۔ خود اعتمادی ہے۔ اپنی بھرپور شخصیت کا احساس ہے! اور جو وہ قدم اٹھا رہے ہیں، وہ ایک مثبت ارادہ اور بلند ہمت و محکم یقین کا نتیجہ ہے۔ بدعت میں جو ہلکا پن ہوتا ہے اور تجدید کرنیوالوں میں عام طور پر جو سطحیت اور خفیف حرکتی پائی جاتی ہے، راشد کے ہاں نہیں ملتی۔ توانائی اور بغاوت۔ ایک صحت مند جسم، جذبات و احساسات سے بھرے ہوئے دل اور ایک

حساس ذہن کی توانائی اور ماضی کی فرسودہ روایات اور ماحول کی دم گھوٹنے والی پابندیوں کے خلاف ایک توانا اور خوددار آدمی کی بغاوت۔ راشد کی شخصیت کے یہ دو بڑے مظہر ہیں۔ انکی نظموں اور انکے انتقادی مضامین کے مطالب اور طرزِ فکر سے ہمیں اختلاف کیوں نہ ہو، لیکن انکی توانائی اور بغاوت کی قوت اور عظمت سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ راشد ابھی نوجوان ہیں جوانی میں جوش و اضطراب اور جذبات کی ہیجان خیزی سے درگزرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اور آخر جوانی میں کس سے لغزشیں نہیں ہوتیں! اور خاص پر راشد جیسا شاعر جس کا حال یہ ہو۔

زندگی تیرے لئے بستر سنجاب و سمور — میں ہوں درماندہ و بےچارہ ادیب
اور میرے لئے افرنگ کی دریوزہ گری — خستہ فکر معاش!
عافیت کوشیٔ آبا کے طفیل — پارۂ نانِ جویں کیلئے محتاج ہیں ہم

ممکن ہے راشد کی شاعرانہ لغزشیں ہمارے ادب کے تسلسلِ حیات کیلئے ناقابلِ قبول ہوں۔ اور ان میں سے بعض کو آخر میں رد کرنا پڑے۔ لیکن راشد کی توانائی اور بغاوت ہماری شاعری اور ہمارے ادبی معیاروں کیلئے ایک نیا شگون ہے۔ حالی کی بغاوت جاگیرداری ذہنیت کے خلاف "لبرلزم" کی بغاوت تھی! اسلئے اس میں اتنی شدت اور تلخی نہ تھی۔ لیکن راشد جس بغاوت کی راہ دکھا رہے ہیں، وہ پسی ہوئی اور پاؤں سے روندی ہوئی انسانیت کی بغاوت ہے۔ ظاہر اس سے میانہ روی اور ملائمت کی توقع کرنا عبث ہے۔

راشد کے دماغ میں کوئی فطری کجی نہیں جیسے بعض نئے شاعروں کے متعلق شکایت کی جاتی ہے۔ اسی طرح اس کے جذبات بھی ایک تندرست اور زندگی میں رچے ہوئے آدمی کے ہیں۔ وہ سوچنے اور محسوس کرنے میں ماضی کی کسی فرسودہ روایت اور حال کے کسی نیک نام دستور کو اپنے اوپر مسلط کرنیکا مطلق روادار نہیں۔ یہی حال انکی جرأت اظہار کا بھی ہے۔ بیشک انکی نظمیں قدرے مشکل ہیں لیکن بقول راشد کے یہ قصور انکے خیالات و افکار کا نہیں کہ ان میں کوئی الجھن اور اٹکاؤ ہو۔ بلکہ اسکی ذمہ داری قدیم اسلوب پر ہے جس نے شاعر کی شخصیت کے آزادانہ اظہار کو اردو شاعری میں تقریباً ناممکن بنا دیا ہے! اور راشد کے اس دعوے کا شاید انکار بھی نہ ہو سکے۔ موصوف کے انتقادی مضامین ان کے ذہن کی صفائی، افکار کی قوت اور صحتِ اجتہاد کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

کاش یہ ممکن ہوتا کہ ہمارا یہ توانا اور باغی ادیب "افرنگ کی دریوزہ گری" کی بجائے شعر و ادب کی دنیا میں اپنا نصیبہ ڈھونڈتا اور اس طرح اپنی توانائی اور بغاوت کی خداداد صلاحیتوں کا حق ادا کرتا۔